Scanned by CamScanner

اردو میں انشائیہ نگاری

ڈاکٹر بشیر سیفی

نذیر سنز پبلشرز
۴۰۔ اے اردو بازار ○ لاہور

Scanned by CamScanner

جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ ہیں

نام کتاب — اُردو میں انشائیہ نگاری

مصنّف — ڈاکٹر بشیر سیفی

اشاعت اوّل — سنہ ۱۹۸۹ء

طابع — نذیر حسین

پرنٹر

قیمت — ۹۰/- روپے

ناشر

Scanned by CamScanner

انتساب

توصیف اور وسیم کے نام

Scanned by CamScanner

ترتیب

پہلا باب

انشائیہ کیا ہے ۱۳—۵۵

انشائیہ کیا ہے —— انشائیہ کی تعریف، اردو کے انشائیہ نگاروں اور نقادوں کی آرا کی روشنی میں —— انگریزی انشائیہ کا پس منظر فرانسیسی مفکر مانتین —— انگریزی ایسے کی اجمالی تاریخ —— بیکن، کاولی، ایڈیسن، اسٹیل براؤن، لاک، سوفٹ، گولڈسمتھ، جانسن، لی ہنٹ، لیمب، چسٹرٹن، لنڈ، گارڈنر درجینا وولف کے ایسیز کا مختصر جائزہ —— انشائیہ کا متبادل انگریزی ایسے یا پرسنل ایسے —— انشائیہ کی ہیئت اور نمایاں اوصاف —— اردو انشائیہ نگاروں کا تصورِ انشائیہ —— انشائیہ کی اصطلاح

دوسرا باب

انشائیہ اور انشاپردازی ۵۶—۷۶

انشاپردازی کی تعریف —— اردو انشاپردازی کا پس منظر، عربی انشاپردازوں عبدالحمید بن یحییٰ، ابن المقفع، الجاحظ، ابن العمید، صاحب بن عباد، خوارزمی، ہمدانی اور حریری کا اثر فارسی انشاپردازوں پر —— فارسی انشاپردازوں قاضی حمید الدین امیر خسرو، ماہرو، محمود گاواں، ظہوری اور ابوالفضل کے اسلوب کا اثر اردو انشا پردازوں پر —— انشاپردازی وصفِ ادب یا صنفِ ادب —— میر عطا حسین تحسین، رجب علی بیگ سرور، محمد بخش مہجور، مولانا غلام غوث بے خبر اور مولانا غلام امام شہید کی انشاپردازی

Scanned by CamScanner

تیسرا باب

انشائیہ اور مضمون نگاری ۷۷-۱۰۹

مضمون کی تعریف ——— مضمون، ایسّے اور پرسنل ایسّے ———
پہلا مضمون نگار، ماسٹر رام چندر یا سر سید احمد خاں ———
اردو مضامین نگاروں ماسٹر رام چندر، سر سید احمد خاں، محسن الملک، وقار الملک
مولوی چراغ علی، مولوی ذکاءاللہ، مولانا حالی، نذیر احمد دہلوی، مولانا شبلی نعمانی اور محمد حسین
آزاد کے مضامین کا انشائیہ کے نقطۂ نظر سے مطالعہ۔

چوتھا باب

انشائیہ اور طنز و مزاح کا پہلا دور ۱۱۰ - ۱۳۱

طنز و مزاح کی مختصر تعریف ——— انشائیہ اور طنز و مزاح ———
——— اردو نثر میں مزاح کا پیش رو، غالبؔ ——— اودھ پنچ کے نثر نگاروں
منشی سجاد حسین، نواب سید محمد آزادؔ، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ
ہجرؔ۔ جوالا پرشاد برقؔ، احمد علی شوقؔ اور پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ کے طنزیہ و مزاحیہ
مضامین کا انشائیہ کی روشنی میں مطالعہ

پانچواں باب

انشائیہ اور انشائے لطیف ۱۳۲ — ۱۸۴

انشائے لطیف کی مختصر تعریف ——— انشائے لطیف، اسلوب یا صنفِ ادب
——— اردو میں انشائے لطیف کے پیش رو، میر ناصرؔ اور شررؔ ———
مخزن کے بعض قلم کار، سر عبدالقادر، آغا شاعر قزلباش، شیخ محمد اکرام

Scanned by CamScanner

عبدالرشید چشتی، مولوی عزیز مرزا اور سر ذوالفقار علی خاں کے مضامین میں انشائیہ
کے اوصاف ۔ انشائے لطیف کے اہم نثر نگاروں، سجاد حیدر یلدرم، مہدی
افادی ۔ نیاز فتحپوری، ل ۔ احمد، جوش ملیح آبادی، سجاد انصاری، میاں بشیر احمد
فلک پیما، خلیقی دہلوی، اختر شیرانی، قاضی عبدالغفار، حکیم یوسف حسن اور حجاب
امتیاز علی کے مضامین میں انشائیہ کا سراغ ______ حامد اللہ افسر
کے انشائیے

چھٹا باب

انشائیہ اور طنز و مزاح کا عبوری دور ______ ۱۸۵—۱۹۵

عبوری دور کے ممتاز طنز و مزاح نگاروں سید محفوظ علی، خواجہ حسن نظامی، ملا رموزی
عبدالماجد دریا آبادی، ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علیخاں کے مضامین کا مطالعہ
اور ان میں انشائیہ کی نشاندہی ۔

ساتواں باب

انشائیہ اور طنز و مزاح کا جدید دور ______ ۱۹۶—۲۳۱

جدید دور کے طنز و مزاح نگاروں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی،
پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، کرشن چندر
سعادت حسن منٹو، شفیق الرحمن، امجد حسین، فکر تونسوی، محمد خالد اختر، ایم ۔ آر کیانی
ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی، مسعود مفتی، احمد جمال پاشا، کرنل محمد خاں، نصیر انور
اور مرزا محمد منور کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین میں انشائیہ کا سراغ ۔

Scanned by CamScanner

آٹھواں باب
جدید انشائیہ ۲۳۲ — ۲۸۴

جدید اردو انشائیہ کے پیش رو ——— ڈاکٹر داؤد رہبر، جاوید صدیقی، اور ممتاز مفتی

——— اردو کے جدید انشائیہ نگاروں ڈاکٹر وزیر آغا، نظیر صدیقی، مشکور حسین یادؔ، مشتاق قمرؔ، جمیل آذرؔ، انور سدیدؔ، غلام جیلانی اصغرؔ، سلیم آغا قزلباش، اکبر حمیدی، کامل القادری، رام لعل نابھوی، محمد یونس بٹ اور دیگر انشائیہ نگار۔

کتابیات ۲۸۵ — ۲۹۶

Scanned by CamScanner

پیش لفظ

"اردو میں انشائیہ نگاری" میرے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے "اردو میں انشائی ادب کا ارتقاء" کا بدلا ہوا روپ ہے اسے موجودہ صورت دینے کے لئے اصل مقالے کا تمہیدی باب نکالنے کے علاوہ درمیانی ابواب میں سے بھی بہت کچھ حذف کیا گیا ہے نیز آخری باب میں ضروری اضافے بھی کئے ہیں۔

جب میں نے ۱۹۸۱ء میں تحقیق کا آغاز کیا تو انشائیے پر تفصیلی کام نہ ہونے کے برابر تھا۔ اور انشائیہ کے بنیادی مباحث بھی طے نہیں ہوئے تھے۔ مثلاً یہ کہ انشائیہ انگریزی ایسے کے متبادل ہے یا پرسنل ایسے کے؟ انشائیہ کی حدود اور بنیادی اوصاف کیا ہیں؟ انشائیہ کا اردو کی قدیم انشا پردازی، مضمون نگاری، طنز و مزاح اور انشائے لطیف سے کیا تعلق ہے؟ آیا انشائیہ کا ان اصناف سے کوئی تعلق بھی ہے یا نہیں؟ چنانچہ یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے سوالات میرا موضوع ٹھہرے۔ اکتوبر ۱۹۸۱ میں خاکہ اور کتابیات کی منظوری کے بعد باقاعدہ کام کا آغاز ہوا اور اواخر ۱۹۸۳ میں مقالہ مکمل ہو گیا۔ اس وقت تک پاکستان اور ہندوستان میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا جا چکا تھا اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا گیا۔ جب مسودہ صاف کیا جا رہا تھا تو جناب مشکور حسین یاد کی کتاب "ممکناتِ انشائیہ" منصۂ شہود پر آئی۔ جس سے مناسب استفادہ کیا گیا۔ میں نے فروری ۱۹۸۴ء میں مقالہ مکمل کر کے یونیورسٹی کو پیش کیا اور دو سال بعد فروری ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹریٹ

کی ڈگری ملی۔ اسی دوران ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر انور سدید کی تصنیف "انشائیہ اردو ادب میں" بھی چھپ گئی۔ انور سدید صاحب نے اگرچہ میرا مقالہ مکمل ہونے کے دو ماہ بعد اپنے کام کا آغاز کیا صہ ۱ مگر چونکہ ان کی کتاب پہلے چھپ گئی۔ اس لئے بعض ایسی باتیں جو شاید پہلی بار میرے مقالے کی اشاعت کے بعد سامنے آتیں ان کی اولیت انور سدید صاحب کو حاصل ہوگئی صہ ۲ کہ ان کے پیش نظر بھی وہی مواد تھا جو میری نظر سے گذر چکا تھا مگر ماخذات کے اشتراک کے باوجود میرا مقالہ نتائج کے اعتبار سے مختلف ہے اور تکرار کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب "انشائیہ کی بنیاد" بھی منظر عام پر آئی مگر اسے زیرِ بحث لانے سے اس لئے گریز کیا گیا ہے کہ اس کے بعض مباحث شدید اختلافی نوعیت کے ہیں جبکہ میرا مقصد انشائیہ کے باب میں محض اپنا مطالعہ پیش کرنا ہے توقع ہے قارئین اس کتاب کو اسی حوالے سے پرکھیں گے۔

تشکر

خاکہ اور کتابیات کی تیاری سے مقالہ کی تکمیل تک مجھے جن محترم و معزز ہستیوں کا تعاون حاصل رہا ہے ان میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سید معین الرحمن اور ڈاکٹر صدیق شبلی بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر جمیل آذر

صہ ۱: بحوالہ یک انٹرویو مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۲ فروری ۱۹۸۵ء۔

صہ ۲: مثلاً ممتاز مفتی کو بطور انشائیہ نگار پیش کرنا وغیرہ۔

Scanned by CamScanner

پروفیسر نظیر صدیقی اور برادرم خاور اعجاز سے بھی اس موضوع پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ میں ان سب کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ مجھے ہمایوں تاجک صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے کہ ان کی نوازشات کے بغیر میں اپنا مقالہ کم از کم دو سال میں مکمل نہیں کر سکتا تھا۔ ص ا ڈاکٹر وحید قریشی میرے مقالے کے نگران تھے، ان کے پُرخلوص مشوروں کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں، بعض کتابوں کی فراہمی کے لئے مس ناہید کوثر (اب ڈاکٹر ناہید جاوید) کی معاونت کے لئے شکر گزار ہوں۔

بشیر سیفی

ص ا: تاجک صاحب یو۔جی۔سی میں میرے افسر تھے۔

پہلا باب

انشائیہ کیا ہے

انشائیہ کیا ہے ؟ اور اردو کا پہلا انشائیہ نگار کون ہے ؟ ان سوالات نے ہمارے نقادوں کو گذشتہ کئی سال سے پریشان کر رکھا ہے ۔ اگرچہ مختلف مکاتبِ فکر کے نقادوں نے ان سوالات کو حل کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مگر یہ مسئلہ سلجھنے کی بجائے الجھتا ہی گیا ۔ یہ مسئلہ اسلیئے بھی پیچیدہ تر ہوتا چلا جا رہا ہے کہ فریقین نے اپنے اپنے نقطۂ نظر میں لچک پیدا کر کے کسی ایک نقطۂ اتصال پر متفق ہونے کے بجائے اسے انا کا مسئلہ بنا لیا ہے ۔ حالانکہ ادب میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوا کرتی ۔ خصوصاً اصنافِ ادب کی تعریف تو بے حد مشکل کام ہے کیونکہ ایک خلاّق ذہن تخلیقی لمحات میں موّاج سمندر کی طرح ہوتا ہے جس کی لہریں اپنی حدود میں رہتے ہوتے بھی بار بار ساحل سے ٹکراتی ہیں ۔ چنانچہ بڑا فنکار فنی سانچوں اور ضابطوں کی پابندی کرتے ہوتے بھی پابندیوں اور ضابطوں کو جزوی طور پر توڑتا پھوڑتا رہتا ہے اور یوں نئے سانچے اور ضابطے وجود میں آتے رہتے ہیں ۔ اردو غزل کی جو تعریف سولہویں صدی میں متعین کی گئی تھی آج کی غزل اس تنگنائے کو مدت ہوئی پار کر چکی ہے ۔ افسانہ کی جو تعریف بیسویں صدی کے اوائل میں پیش کی گئی تھی ۔ اگر اس کو مدِ نظر رکھا جاتے تو جدید افسانہ شاید افسانے کے زمرے ہی سے خارج ہو جاتے کہ کہانی کا عنصر جو افسانے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے جدید تر افسانے میں اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے لہٰذا اس بات پر اصرار مناسب نہیں کہ ہر لکھنے والا ایک خاص سانچے میں مقیّد ہو کر رہ جاتے ۔ خصوصاً اسلیئے بھی کہ ہر ادیب اور قلمکار ایک مخصوص مزاج کا حامل ہوتا ہے ۔ جو بہر صورت اس کی تخلیقاتِ نظم و نثر میں جھلکتا ہے ۔ بنظر

غائر دیکھا جاتے تو معلوم ہوگا کہ مزاج کا اختلاف اور تنوع ہی ایک لکھنے والے کو
دوسرے سے الگ اور ممتاز کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ لکھنے والے
کو کھلی چھٹی دے دی جاتے کہ وہ مروجہ سانچوں کو خاطر میں نہ لاتے اور جو چاہے لکھتا
پھرے۔ یہی وجہ ہے اصنافِ ادب کی کوئی نہ کوئی متفقہ تعریف متعین کرنے کی کوشش
کی جاتی ہے اور ہر لکھنے والے پر حتی الامکان اس کی پابندی لازمی ہوتی ہے تاکہ ایک
صنف کو دوسری اصناف سے بآسانی تمیز کیا جا سکے یہ اسی پابندی کا نتیجہ ہے کہ ہم
غزل، نظم، قصیدہ اور مرثیہ کو صنفِ شعر سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک دوسرے
سے الگ کر سکتے ہیں۔ جس طرح ہم کہانی، افسانہ اور ناول کو ایک دوسرے میں گڈمڈ نہیں
ہونے دیتے اسی طرح انشائیہ کو بھی انشائیہ سے ملتی جلتی تحریروں یعنی عمومی مضمون
اور طنزیہ و مزاحیہ مضمون سے الگ کر سکتے ہیں۔

کسی بھی صنفِ ادب کی تعریف متعین کرنے کے دو بڑے ماخذ ہوتے ہیں۔
اولاً اس صنف کے سربرآوردہ قلمکاروں کی تخلیقات اور ثانیاً نقادانِ فن کی آراء
جو بہرحال انہی تخلیقات کی روشنی میں مرتب ہوتی ہیں انشائیہ کے خدوخال واضح کرنے
کے لیے انشائیہ کے نقادوں اور انشائیہ نگاروں کی آراء کا مختصر جائزہ یہاں پیش کرنا یقیناً
برمحل ہوگا۔

سید ظہیر الدین مدنی اپنی تالیف "اُردو الیسیز" میں رقم طراز ہیں۔

"راقم نے اپنی کتاب کو "اردو الیسیز" کا نام دیا ہے۔ ایسا کوئی لفظ ذہن میں نہیں آتا جس سے
مفہوم بخوبی ادا ہو سکتا ہو۔ لفظ الیسے (Essay) فرانسیسی لفظ اسائی (Essai) کی انگریزی
شکل ہے۔ اور اسائی (Essai) عربی لفظ "السّعی" کی فرانسیسی شکل معلوم ہوتی ہے۔ دونوں
الفاظ "کوشش" کے مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔ مانا جاتا ہے کہ لفظ اسائی (Essai) یونانی
زبان سے فرانسیسی زبان میں آیا ہے۔ مگر گمانِ غالب ہے کہ عربی لفظ "السّعی" ہی اس کی اصل ہے

صدیوں تک اندلس اور جنوبی فرانس پر عربوں کا سکہ چلتا رہا ہے اسی وجہ سے فرانسیسی زبان میں لاطینی سے بھی زیادہ عربی الفاظ رائج ہیں۔ ممکن ہے اساق (Essai) ان میں سے ایک ہو۔ آج کل اس صنف کو انشائیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انشا کے معنی "پیدا کرنا" ہیں۔ البتہ (Essay) بھی ایک تخلیق ہے۔ اور اس اعتبار سے اسے انشائیہ کہنا نامناسب نہیں "۔[1]

اردو ایسیز کا تعارف کراتے ہوتے نیاز فتحپوری لکھتے ہیں۔

(Essay) ایک خاص نہج و اسلوب کے مقالے کو کہتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کی Soliloquy ہے۔ زیادہ تر Objective قسم کی جسے ہم Self-Communation بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کے فکر و تصور کا نتیجہ ہے۔ جس میں تجزیۂ جذبات نفسیاتی مطالعہ، منطقی استدلال، فلسفیانہ تفکّر، متصوفانہ استقرا اور انشائے عالیہ کا جمالیاتی اسلوب سب کچھ پایا جاتا ہے۔

اگر کوئی صاحبِ دل صوفی اپنے ذاتی مراقبہ Meditation کی کیفیات کو اچھے الفاظ میں بیان کر سکے تو ہم اسے نہ مقالہ کہیں گے نہ مضمون۔ محض (Essay) کہہ سکیں گے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض مجذوب اپنی ترنگ میں خدا جانے کیا کیا کہا کرتے ہیں (کوئی سنے نہ سنے) اسے انگریزی میں Thinking Aloud کہتے ہیں۔ لیکن اگر اس کی یہی باتیں مربوط، مسلسل و بامعنی ہوں تو ہم اسے Essay کے سوا کچھ نہ کہہ سکیں گے.....

Essay صرف مؤثرات و تاثرات کے باہمی ربط کو پیش کرتا ہے اور اس حیثیت سے وہ Subjective زیادہ اور Objective کم ہے برخلاف انتقادی مقالات کے وہ بالکل Objective ہوتے ہیں "۔[2]

---

[1] اردو ایسیز، مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بمبئی اول ۱۹۵۸ء دیباچہ ص ۷۔

[2] ایضاً، ص ۸۔۹

نظیر صدیقی "شہرت کی خاطر" کے دیباچہ میں انشائیہ کے بارے میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں
انگریزی ادب میں لفظ ایسے سنجیدہ اور ہلکے پھلکے (Light) دونوں قسم کے مضامین کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ انگریزی Essay کے ہر انتخابی مجموعے میں دونوں قسم کے مضامین نظر آتے ہیں۔ پھر بھی جب کبھی اور جہاں کہیں ایسے کی تعریف یا اس کے تصور سے بحث ہوتی ہے وہاں عموماً Light Essay ہی پیش نظر ہوتا ہے نہ کہ علمی اور تنقیدی مقالہ۔ لیکن انگریزی میں Light Essay کی ترکیب یا اصطلاح دیکھنے میں نہیں آئی[1]۔ البتہ مجھے جے۔ بی۔ پریسٹلی یا آئیور براؤن کے ایک مضمون میں Personal Essay کی اصطلاح ضرور ملی[2]

لفظ ایسے فرانسیسی زبان کی دین ہے۔ عام طور پر ادب کی اس صنف کا موجد فرانسیسی ادیب مانتین مانا جاتا ہے۔ مونتین سے لے کر دورِ حاضر تک کے انشائیہ نگاروں اور انشاپردازوں نے ایسے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس اصطلاح سے اِن لوگوں کا مقصود علمی یا تنقیدی مضمون نہیں

---

[1] نظیر صدیقی صاحب کی یہ رائے محلِ نظر ہے۔ کہ انگریزی میں لائٹ ایسے کی اصطلاح موجود نہیں Charles. B. Shaw نے ۱۹۴۸ء میں ایک کتاب بعنوان۔ American Essays مرتب کی تھی جسے New Amercian Library نے شائع کیا۔ اس کے دیباچہ میں اس نے جابجا Light Essay کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

[2] پرسنل ایسے کی اصطلاح متعدد دوسرے ادیبوں نے بھی استعمال کی ہے۔ مثلاً C.H. Lockitt نے The Art of the Essayist کے دیباچہ میں پرسنل ایسے کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔

Scanned by CamScanner

بلکہ Light Personal Essay یا رہا ہے۔ ؎۱

ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" اس کا کام تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنا اور ہمیں عادت اور تکرار کے حصار سے لحظہ بھر کے لیے آزادی دلانا ہے۔ تاکہ ہم غیر جانبدارانہ طریق سے زندگی کے روشن یا تاریک رخ کا جائزہ لے سکیں۔ واضح رہے کہ انشائیہ کا خالق کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا اور نہ کوئی مشورہ ہی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کوئی مکمل نقطۂ نظر پیش کرنے سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ اس کا کام محض ایک عام چیز کے کسی انوکھے اور تازہ پہلو کی طرف آپ کو متوجہ کرنا اور آپ کو ایک مخصوص انداز سے سوچنے کی ترغیب دینا ہے۔" ؎۲

سید صفی مرتضیٰ کی مرتب کردہ کتاب " اردو انشائیہ " کا تعارف کراتے ہوئے احتشام حسین نے انشائیہ کی توضیح ان الفاظ میں کی ہے۔

" اِدھر کچھ دنوں میں اس خاص قسم کے مضامین کیلئے جنہیں انگریزی میں ایسے کہا جاتا ہے انشائیہ کی اصطلاح عام ہو گئی ہے اور بظاہر مناسب بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ مخصوص قسم کے مضامین عام علمی مقالوں، مضمونوں اور دوسرے انشاپردازی کے نمونوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اردو اور بعض دوسری مشرقی زبانوں میں ایسے تمام ادبی مضامین انیسویں صدی سے اس وقت تک مغربی ادب کے تاثر کا نتیجہ کہے جا سکتے ہیں۔ اس لئے ان مضامین پر نظر پڑتے

؎۱ شہرت کی خاطر۔ نظیر صدیقی۔ پاک کتاب گھر ڈھاکہ۔ اول ۱۹۶۱ ص ۳

؎۲ تنقید اور احتساب۔ وزیر آغا۔ جدید ناشرین۔ لاہور اول ۱۹۶۸ء ص ۲۴۸-۲۴۹

Scanned by CamScanner

ہی انگریزی اور بعض دوسری زبانوں کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے اور " ایسے " کی خصوصیات کا تصور کیے بغیر اردو انشائیوں کے حسن و قبح کو جانچا نہیں جا سکتا۔[1]

ڈاکٹر وحید قریشی " اردو کا بہترین انشائی ادب " کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

" ذہن کو یک لخت ایک نئی دنیا میں لا ڈالنا اس ادب پارے کا کام ہے۔ اس سے زندگی کو نئے زاویے سے دیکھنے کا شعور پیدا ہوتا ہے اور روزمرہ زندگی کے پامال گوشے نئی معنویت اختیار کرتے ہیں۔ اس میں جو بات بھی کی جاتی ہے اپنی ذات کے حوالے سے کی جاتی ہے یا کم از کم اپنی ذات کو اس میں دخیل ضرور رکھا جاتا ہے۔ انشائی ادب کا اختصار اس کا بنیادی وصف ہے۔ جس طرح ناول کے مقابلے میں افسانہ زندگی کے حقائق کو تفصیلی طور پر دیکھنے کی بجائے چند اشاروں سے حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے اور اپنی بنیادی فضا کے سہارے زندگی کی معنویت کو ابھارتا ہے۔ اسی طرح انشائیہ زندگی کی بوقلمونی کے کسی ایک رخ کو پیش کر کے ساری زندگی کو پہچاننے کی دعوت دیتا ہے۔"[2]

ڈاکٹر سلام سندیلوی " ادب کا تنقیدی مطالعہ " میں انشائیہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں

" انشائیہ کا مفہوم اردو ادب میں تقریباً وہی ہے جو انگریزی میں Essay کا ہے۔ لغوی اعتبار سے Essay ' ایسے ' کا مفہوم ہے۔ کسی موضوع کے لیے کوشش کرنا۔ اس کا مقصد جامع اور مکمل تفتیش نہیں ہے بلکہ زندگی کے کسی پہلو کے چند نقوش کو ابھارنا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ انشائیہ

---

[1] اردو انشائیہ مرتبہ سید صفی مرتضیٰ۔ نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ اول ۱۹۶۱ ص ۲

[2] اردو کا بہترین انشائی ادب مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی۔ میری لائبریری۔ لاہور اول ۱۹۶۲ ص ۱۵

مضمون، مقالہ اور تنقید میں فرق نہیں کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر اور اصولی اعتبار
سے یہ سخت غلطی ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کے مقاصد الگ الگ ہیں
اور ہر ایک کی حدود جدا جدا ہیں۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ انشائیہ مضمون نگاری کا
وہ جزو ہے جس میں مصنف اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات کو پیش کرتا ہے۔
اس پیشکش میں اس کی شخصیت کافی نمایاں رہتی ہے۔ اس طرح انشائیہ میں
ایک خاص قسم کا داخلی رنگ پایا جاتا ہے۔ مگر مضمون میں خارجی رنگ
غالب رہتا ہے ۱؎

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے بھی اپنی کتاب "اصنافِ ادب" میں
اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"یہ نوخیز صنفِ نثر انگریزی ادب سے درآمد کی گئی ہے اور انگریزی Essay
کی ایک شکل ہے۔ موضوع کی ندرت اور تکنیک کی جدت کے اعتبار سے
اردو کی تمام نثری اقسام سے بالکل مختلف ہے۔ ـ ـ ـ ـ ـ اردو میں
انشائیہ ایک جدید صنفِ نثر کی حیثیت سے جس انداز میں ہمارے سامنے آیا
ہے اس کا انگریزی انشائیے کی روایت سے گہرا تعلق ہے۔ انشائیے کا
موجد ایک فرانسیسی مصنف مونتین ہے" ۲؎

مندرجہ بالا آراء کا جائزہ لینے کے بعد پہلا نتیجہ یہ مرتب ہوتا ہے کہ انشائیہ کی
صنف انگریزی ادب کی وساطت سے اردو میں آئی اور انگریزی Essay کے
مترادف ہے۔ چنانچہ جب اردو میں انشائیہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اور انشائیہ

۱؎ ادب کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ میری لائبریری لاہور۔ چہارم ۱۹۷۱ء ص ۲۰۴
۲؎ اصنافِ ادب۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۷۶ ص ۱۵۶

کو انگریزی Essay کا متبادل بتایا گیا تو یہ فرض کر لیا گیا کہ سر سید احمد خاں سے لے کر دورِ حاضر تک جتنے بھی ادبی، علمی، طنزیہ و مزاحیہ اور انشائی مضامین لکھے گئے وہ سب انشائیے ہیں کیونکہ انشائیہ بھی انگریزی Essay کے مترادف ہے اور مضمون بھی۔ بالفاظِ دیگر انشائیہ کو مضمون کا مترادف سمجھ لیا گیا اور ہر قسم کے مضامین کو انشائیہ کہا جانے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کی اصطلاح "مضمون" بھی انگریزی Essay ہی کے مترادف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اردو میں باقاعدہ مضمون نگاری کا آغاز سر سید احمد خاں سے ہوتا ہے۔ اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہ ادب برائے ادب کے قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک ادب ان کے اصلاحی مقاصد کے حصول کا ایک کارآمد ذریعہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے انہی انگریز مصنفین سے اثر قبول کیا جو اپنے وقت کے مصلح ادیب تھے اور سر سیّد ہی کی طرح انگریزی معاشرے کو قباحتوں سے پاک کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے سر سید احمد خاں Essay کی اصل روح کے مطابق انشائیہ لکھنے کے بجائے اپنے اصلاحی مقاصد کے تحت Essay کے نام پر اصلاحی مضامین اور سنجیدہ مقالات سپردِ قلم کرتے رہے۔ نتیجتاً اردو ادب میں مضمون کی اصطلاح ہر قسم کے ادبی سیاسی مذہبی، فلسفیانہ، معاشرتی تنقیدی اور انشائی مضامین کے لئے مستعمل ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ مقالہ کی اصطلاح بھی مضمون کے مترادف استعمال ہوتی رہی ہے۔ سر سید احمد خاں کے ہر قسم کے مضامین و مقالات بلکہ شذرات کو بھی "مقالاتِ سر سید" کے نام سے شائع کرنا اس حقیقت کا غماز ہے سو اس حقیقت کے باوجود کہ سر سید نے انگریزی ادیبوں کے تتبّع میں مضمون نگاری شروع کی ان کا کوئی مضمون بھی کلی طور پر Essay کی اصل روح کے مطابق نہیں۔ ایسا ہونا اس لیے بھی بعید از قیاس نہیں کہ سر سید نے جن ادیبوں کے تتبّع میں مضمون نگاری شروع کی خود ان کے مضامین Essay کی توسیع

شکل ہیں۔ چنانچہ مضمون کی اصطلاح اس ایسّے کے مترادف نہیں جس کا آغاز مونتین نے کیا تھا بلکہ اس ایسّے کے متبادل ہے جس کے مفہوم میں مونتین کے بعد بے پناہ وسعت آگئی تھی اور جس کے تحت ہر قسم کی مضمون نگاری آجاتی ہے۔ اردو میں مضمون نگاری کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو کے ادیبوں نے عموماً انگریزی ایسّے کی توسیعی شکل ہی کو مدّنظر رکھا اور اپنی ہر قسم کی غیر افسانوی نثری تحریروں کے لیے مضمون یعنی Essay کی اصطلاح استعمال کرتے رہے لیکن المیہ یہ ہے کہ جب کچھ ادیبوں نے Essay کی اصل روح کے مطابق اپنی نگارشات انشائیہ کے نام سے پیش کیں اور انھیں انگریزی کے خالص ایسّے کا متبادل بتایا تو ان ذہنوں نے جو صرف ایسّے کی توسیعی شکل سے آشنا تھے یہ سمجھ لیا کہ انشائیہ کی اصطلاح مضمون یعنی عمومی ایسّے کا بدل ہے لہٰذا ہر قسم کے مضامین انشائیے ہیں۔ بقول احمد جمال پاشا مضمون کو انشائیہ کہنے کی طرح ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ڈالی۔

> انھوں نے مضمون نگاری یا Essay پر تحقیق کی ہے لیکن بعد میں تحقیقی مقالے یا اس کتاب کے مختلف اجزا "مضمون" کی بجائے "انشائیہ" کے عنوان سے جا بجا رسائل میں شائع کراتے۔ جیسے آل احمد کے تنقیدی انشائیے [1]

انشائیہ نگاروں اور انشائیہ کے نقادوں نے اگرچہ اس امر کی وضاحت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کہ انشائیہ ایسّے کی عمومی شکل کے متبادل نہیں بلکہ ایسّے کی ایک خاص نوع کے متبادل ہے جسے اب انگریزی میں پرسنل یا لائٹ ایسے کہتے اور گذشتہ صفحات میں منقول آرا میں بھی یہ بات بالالتزام موجود ہے کہ انشائیہ عمومی مضمون کے مترادف نہیں بلکہ مضمون کی ایک خاص شکل ہے۔ جس میں لکھنے والا

---

[1] انشائیہ کی اصطلاح۔ احمد جمال پاشا۔ اردو زبان سرگودھا۔ انشائیہ نمبر ۱۹۸۳ء ص ۲۵

کسی موضوع پر اختصار کے ساتھ اور شخصی نقطۂ نظر سے اظہارِ خیال کرتا ہے۔ مگر اِس کے باوجود بعض لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ عرش صدیقی کو آج بھی اس بات پر اصرار ہے کہ انشائیہ کی اصطلاح کو ایک عمومی اصطلاح پر قبول کرلیا جاتے۔ ان کا کہنا ہے۔

"بیکن نے جس طرح اس صنف کو استعمال کیا دراصل اسی استعمال نے Essay کی اصطلاح کے جدید معانی اور حدود کا تعین کر دیا چنانچہ میں بعض نقادوں کی یہ رائے تسلیم نہیں کروں گا کہ Essay صرف Light یا ہلکا پھلکا ادب پیش کرنے کا ذریعہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب انگریزی میں بھی Treatise قسم کے الفاظ متروک ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ بھی Essay نے لے لی ہے۔ Article کی اصطلاح رائج ضرور ہے لیکن Essay کا استعمال بہرحال زیادہ ہے آج Essay میں افسانہ اور ناول اور ڈرامہ وغیرہ کو چھوڑ کر باقی تقریباً سبھی نثری تحریریں شامل ہیں۔ اس کا ثبوت آسانی سے Essay کی کوئی بھی کتاب دیکھ لینے سے مل جاتا ہے۔ Essay کو عمومی اصطلاح کے طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے اور مختلف قسم کے Essays کی خانہ بندی کے لئے Essay کے ساتھ کوئی اور لفظ ملا کر ایک مرکب اصطلاح وضع کرلی گئی جو کسی خاص قسم کی بنیادی صفت کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ اس سے زیادہ کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ان اصناف کی مکمل علیٰحدگی اور خانہ بندی ممکن نہ تھی۔" [1]

دلچسپ بات یہ ہے کہ عرش صدیقی اسی مضمون میں اس حقیقت کو بھی

---

[1] اوراق، لاہور، اکتوبر۔ نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۲۱۹-۲۲۰

تسلیم کرتے ہیں کہ "اس بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ جس تحریر کو انشائیے کا نام دے کر اس کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ مختلف اقسام کے مضمونوں سے ایک الگ، منفرد اور مختلف چیز ہے اور اس سے بھی پورا اتفاق ہے کہ اس قسم کے انشائیے میں جس داخلی رنگ، شگفتگی، آزادہ روی اور خوشگوار غیر سنجیدگی وغیرہ کی نشاندہی کی جاتی ہے وہ اس قسم سے خاص ہیں "۔ ؎۱

جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ انشائیہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے عمومی مضامین سے الگ اپنی انفرادیت رکھتا ہے تو پھر اس بات پر اصرار مناسب نہیں کہ مضمون کو بھی انشائیہ کے نام سے پکارا جائے اور سہولت کے لیے جس طرح مضمون کے ساتھ طنزیہ، مزاحیہ، تنقیدی وغیرہ کے سابقے استعمال کئے جاتے ہیں اس طرح کے سابقے انشائیہ کے ساتھ لگا دیئے جائیں۔ "سوال یہ ہے کہ آج تک اس کام کے لیے مضمون کا لفظ بڑی خوش اسلوبی سے استعمال ہوتا رہا ہے اور طنزیہ مضمون، مزاحیہ مضمون، تنقیدی مضمون وغیرہ تراکیب بھی مستعمل ہو چکی ہیں تو پھر یکایک مضمون کے بجائے انشائیہ کا لفظ استعمال کر کے تراکیب کے ایک نئے سلسلے کو جنم دینے کا کیا جواز ہے "۔ ؎۲

اردو انشائیہ کے ایک اور نقاد محمد ارشاد بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہیں کہ انشائیہ کی اصطلاح وسیع تر ایسے پر محیط ہے۔ ایک مضمون میں لکھتے ہیں

" صنفِ انشائیہ کے اردو نقاد نہ صرف تسلیم بلکہ اصرار بھی کرتے ہیں کہ انگریزی اصطلاح ایسے کا صحیح ترجمہ اور اردو میں اس کا متبادل لفظ مضمون ہے اگر یہ درست ہے تو

؎۱ اوراق، لاہور، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۲ء۔ ص ۲۱۸

؎۲ انشائیہ کی بحث، وزیر آغا۔ اوراق۔ لاہور۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۲۲۹

ان کی توجہ اس طرف مبذول کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں
ان کے پاس کوئی ایسی بنیاد باقی نہیں رہتی جس کی رو سے انشائیہ کے
مضمون ہونے سے انکار کر سکیں۔ پرسنل ایسے "انشائیہ" اس ایسے "مضمون"
کو کہا جاتا ہے جو پرسنل "شخصی" کی صفت سے متصف ہو۔ جس طرح عربی
گھوڑا گھوڑا ہی ہوتا ہے لیکن بعض مخصوص اوصاف کی بنا پر جو صرف عربی
گھوڑے میں موجود ہیں گھوڑوں کی دیگر انواع سے ممیز کیا جاتا ہے لیکن ان
مخصوص اوصاف کی بنا پر گھوڑوں کی جنس سے خارج نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح
پرسنل ایسے "انشائیہ" نوع ہے جسے پرسنل ہونے کی صفت سے متصف
ہونے کی بنا پہ ایسے "مضمون" کی دیگر انواع سے ممیز کیا جاتا ہے لیکن
اس صفت کی بنا پر وہ اپنی جنس "مضمون" سے خارج نہیں ہو جاتا۔ ہر
انشائیہ مضمون ہی ہوتا ہے اسی طرح جسطرح عربی گھوڑا گھوڑا ہی ہوتا ہے۔[1]
محمد ارشاد کی یہ بات درست ہے کہ انشائیہ مضمون نگاری کا ایک مخصوص
انداز ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر مضمون انشائیہ ہوتا ہے۔ محمد ارشاد فلسفہ
کے استاد ہیں اور انھوں نے فلسفیانہ استدلال سے کام لیا ہے۔ ارسطو
نے حدو تعریف کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ کسی شے کی وضاحت اس انداز سے
کی جاتے کہ اس کا جوہر Essence نکھر کر نظر و بصر کے سامنے آجاتے اور اس
ضمن میں جس صورت کو اہل منطق میں قبولیت حاصل ہوتی ہے وہ ترکیب و تجزیہ
کا عمل ہے جو "جنس" اور "فصل" پر مبنی ہے اور جس کے تحت انسان کے
لئے "حیوانِ ناطق" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے

---

[1] موئیدین انشائیہ اور انشائیہ نگار۔ محمد ارشاد۔ فنون لاہور۔ جولائی اگست ۱۹۸۲ء ص ۱۴۷

"حیوانِ ناطق" کی ترکیب میں "حیوان" وہ جنس ہے جو متعدد انواع پر محیط ہے اور "ناطق" وہ وصف یا فصل ہے جو اسے دوسرے حیوانوں سے ممتاز کر کے انسانیت کے مقام پر فائز کرتا ہے۔ یعنیہٖ پرسنل ایسّے، ایسّے ہوتے ہوئے بھی ایسّے سے الگ ہو جاتا ہے جب اس کے ساتھ پرسنل کا سابقہ لگا دیا جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے "حیوانِ ناطق" مطلق حیوان نہیں رہتا۔ جب اس کے ساتھ ناطق کا لاحقہ لگا دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وزیر آغا کا موقف یہ ہے کہ انشائیہ ایک چیزے دیگر ہے اور اسے مضمون نگاری کے تحت شمار نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

" یہ دیکھنے کے لئے کہ انشائیہ مضمون نگاری کی روایت سے کس حد تک جدا ہے میں نے ایک مختصر سا شجرہ مرتب کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے غائر مطالعے سے بات آئینہ ہو جائے گی۔

ادب

نثر — شاعری

داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، سوانح عمری، سفر نامہ، انشائیہ، مضمون

طنزیہ مضمون، مزاحیہ مضمون، تنقیدی مضمون، علمی مضمون، تحقیقی مضمون
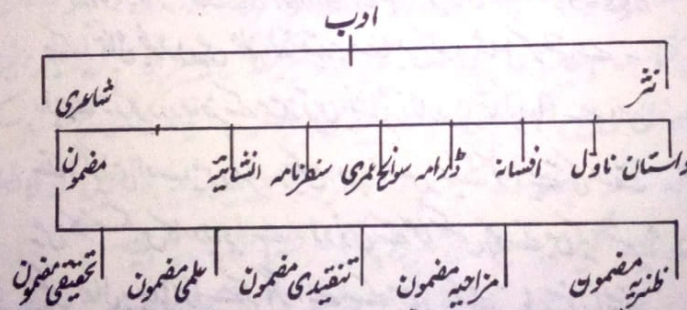
اس شجرے سے یہ بات مترشح ہے کہ انشائیہ مضمون کی شیلی نہیں بلکہ ایک الگ صنفِ ادب ہے۔ چنانچہ جب پروفیسر غلام جیلانی اصغر یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ انشائیہ ایسّے (مضمون) سے مختلف ہے یا سلیم اختر لکھتے ہیں کہ انشائیہ کو بالعموم مضمون سے خلط ملط کرتے ہوتے مزاحیہ، طنزیہ یا تاثراتی مضمون ایسی شے سمجھ لیا گیا ہے جو کہ قطعی غلط

Scanned by CamScanner

ہے۔ تو دونوں حضرات اس گرد کو صاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو ایسے کے سلسلے میں مغربی ادب پر مسلط ہوتی اور پھر اردو میں بھی منتقل ہو گئی"

میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انشائیہ بنیادی طور پر ایسے ہی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزی ادب میں ایسے کی اصطلاح بے حد وسعت کی حامل رہی ہے اور اس کے تحت خالص ایسے (انشائیہ) کے علاوہ ہر قسم کے سنجیدہ، طنزیہ، مزاحیہ، تنقیدی، اصلاحی اور فلسفیانہ مضامین لکھے جاتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے انگریزی ایسیز کے انتخابی مجموعوں میں ہر قسم کے مضامین نظر آجاتے ہیں۔ نظیر صدیقی اس صورتِ حال پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

انگریزوں کی یہ بوالعجبی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب یہ قوم ایسے کی اصطلاح سے Light یا Personal Essay مراد لیتی ہے تو Essays کے انتخابی مجموعوں میں علمی اور تنقیدی مضامین کیوں شامل کر لیتی ہے۔

رابرٹ لنڈ جو دورِ حاضر کے ممتاز ترین انشائیہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے اس نے انگریزی ادب میں صرف بیکن اور چارلس لیمب کو ایسے کی صنف میں کلاسکس کا درجہ دیا ہے۔ دونوں کے کلاسکس ہونے میں کیا شبہ؟ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسے کے معنی لائٹ یا پرسنل ایسے کے ہیں تو کیا بیکن کے Essays کو بھی Light یا Personal Essay کہہ سکتے ہیں۔ اس سوال کا جواب جو بھی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر ایسے کی اصطلاح سے Personal Essay مراد

تنقید اور مجلسی تنقید۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ آئینہ ادب، لاہور، دوم ۱۹۸۱ ص ۷۵-۷۶

لیے جاتے ہیں اور Essayist اسی شخص کو کہا جاتا ہے جو pesonal Essay لکھتا ہے اس بنا پر میرا خیال ہے کہ Essays کے انتخابی مجموعوں میں علمی، تاریخی اور فلسفیانہ مضامین ہرگز شامل نہیں کرنے چاہئیں اور اس قسم کے مضامین لکھنے والوں کو انشائیہ نگاروں یا Essayists میں شمار کرنے کی بجائے انھیں ان کے موضوعات کے اعتبار سے نقاد و مورخ اور مفکر کہنا چاہیے۔[1]

خوشی کی بات ہے کہ دورِ حاضر کے انگریزی انشائیہ نگاروں نے اپنے انشائیوں کو عام ایسیز سے الگ کرنے کے لیے ان کے ساتھ پرسنل یا لائٹ کے سابقے لگانے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ اب ایسی کتابیں بھی مرتب ہونے لگی ہیں جن میں پرسنل ایسیز کو دیگر انواع کے ایسیز سے الگ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ A book of English prose ایک ایسی ہی کتاب ہے جس میں ایسیز کو لٹریری ایسیز، کریٹیکل ایسیز، پرسنل ایسیز وغیرہ کے خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے انگریزی ادب میں ایسے کی ترویج و ترقی کے ساتھ ساتھ ایسے کے مفہوم اور تصور میں جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی وضاحت کے لیے انگریزی ایسے کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

انشائیہ کی صنف کا بانی فرانسیسی مفکر مانتین سمجھا جاتا ہے جس نے اپنے شخصی تاثرات و تجربات کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کر کے انھیں Essais کا نام دیا جس کے لغوی معنی سعی و کوشش کے ہیں۔ انگریزی Essay تو فرانسیسی Essai ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ مانتین کے ایسیز آزادہ روی، شگفتگی،

---

[1] شہرت کی خاطر - نظیر صدیقی - ص ۱۰۵

پیش کیتے ہیں۔ اگرچہ انگریزی ادب میں اس کے انشائیوں کو بلند مقام حاصل نہیں
لیکن انداز اور طریقۂ کار کے لحاظ سے اسے انگریزی کا پہلا کامیاب انشائیہ نگار کہنا چاہیے
Of myself ، Of solitude اور Of Agriculture
ابراہم کاولی کے معروف انشائیے ہیں۔

اسے انگریزی انشائیے کی بدقسمتی کہا جا سکتا ہے کہ جس شخص نے انگریزی ادب
کو اس صنف سے روشناس کرایا اس نے اسے ہلکا پھلکا مضمون بنا ڈالا اور جن
ادیبوں نے اس صنف کو شہرت اور مقبولیت بخشی انھوں نے اسے اصلاحی
مضمون بنا دیا۔ میری مراد ایڈیسن اور اسٹیل سے ہے جنھوں نے انشائیہ یعنی ایسے
کو انکشافِ ذات کے بجائے اصلاحِ معاشرہ کے لیے استعمال کیا۔ انھوں نے اپنے
مقصد میں یقیناً کامیابی حاصل کی مگر ایسّے کو اس کے اصل جوہر سے دور کر دیا۔ لیکن
ایسا بھی نہیں کہ ایڈیسن اور اسٹیل ایسّے کی ماہیت اور اس کے تقاضوں سے لاعلم
تھے۔ ایڈیسن نے اپنے ایک مضمون میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اس کی سب تحریریں
ایسّے کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"وہ میری روزانہ تحریریں جو میں قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ان میں سے کچھ وہ
ہیں جو باضابطہ دائرہ تحریر میں لائی جاتی ہیں اور کچھ ایسی خود رو تحریریں ہوتی ہیں
جو ایسّے کے نام سے موسوم ہیں۔ جہاں تک پہلی قسم کی تحریروں کا تعلق ہے
انھیں لکھتے وقت میرے ذہن میں ان کا مکمل خاکہ ہوتا ہے۔ جب کہ دوسری
قسم کی تحریروں کے لیے اتنا کافی ہے کہ میرے ذہن میں ایک موضوع پر متعدد
خیالات ہوں جنھیں میں بغیر کسی کاوش کے اس طرح قلمبند کرتا چلا جاؤں کہ وہ ایک
دوسرے میں سے پھوٹتے ہوتے دکھائی دیں۔ موخر الذکر اندازِ تحریر سینیکا
اور مانٹین سے منسوب ہے"۔[1] (حوالہ آئندہ صفحہ پر)

بالفاظِ دیگر ایڈیسن کو اس بات کا مکمل احساس تھا کہ وہ ایسے کے نام پر ایسے انشائیہ، کے علاوہ ایسی تحریریں بھی پیش کر رہا ہے جنہیں ایسے انشائیہ، سے کوئی تعلق نہیں اصولاً اسے اوّل الذکر تحریروں کے لیے کوئی نئی اصطلاح وضع کرنی چاہیے تھی مگر اس مشقت سے بچنے کے لیے اس نے ایسے کی بنی بنائی اصطلاح کو استعمال کیا جس کے باعث ایسے کی اصطلاح وسعت پذیر ہوگئی۔ ایسے کی اصطلاح میں وسعت اس لیے بھی آئی کہ ایڈیسن اور اسٹیل نے جو اصلاحی مضامین لکھے ان میں بھی انشائیہ کا غیر رسمی اندازِ نگارش موجود ہے۔ دوسری طرف ان کے خالص انشائیے بھی اصلاحی جذبے سے مملو ہیں۔

A citizen's Diary ، On the cries of London
Sunday in the country ، The exercise of the fan
The Lion in the opera ، Ladies Head-dress
The Royal Exchange ، ایڈیسن کی نمائندہ تخلیقات ہیں۔ اسٹیل کی نمائندہ تخلیقات میں
The trumpet club ، The spectator Club
A days' Ramble اور A prize Fight
کے علاوہ Recollection of childhood کو شامل کیا جاسکتا ہے۔

ایڈیسن اور اسٹیل نے ایسے کی اصطلاح کو اصلاحی مضمون کے لیے

---

۱ The spectator, Edited by prof: C. Gregory Smith, Everyman's Library, New York, 1966, Valume four, page, 9

استعمال کیا تو براؤن نے مذہبی اور اخلاقی مضامین کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی۔ جان لاک نے اپنی ضخیم فلسفیانہ کتاب کو An Essay Concerning Human understanding کے نام سے پیش کر کے ایسے کی اصطلاح کو فلسفیانہ مقالے کے لیے استعمال کیا تو الگزنڈر پوپ نے اپنی منظوم کتاب کے لیے اس اصطلاح کو استعمال کر کے اس کا دائرہ نظم تک پھیلا دیا بنابریں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں ایسے کی اصطلاح کا استعمال انتہائی غیر محتاط طریقے سے روا رکھا گیا۔ اردو (اور انگریزی) ادب میں ایسے کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں اسی غیر محتاط روش کا نتیجہ ہیں جو اٹھارویں صدی میں روا رکھی گئیں۔

ایڈیسن اور اسٹیل کے بعد ایسے کے ضمن میں گولڈ سمتھ کو اہمیت حاصل ہے۔ گولڈ سمتھ نے اگرچہ اپنے ایسیز میں مزاح سے کام لیا ہے لیکن اس کے انشائیے ہنسانے اور قہقہہ لگانے کی ترغیب دینے کی بجائے قاری کو تبسم زیر لب کی کیفیت سے سرشار کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ گولڈ سمتھ اپنے زمانے میں بے حد کامیاب اور ہر دلعزیز رہا۔ ہف واکر اپنی کتاب "انگلش ایسے اینڈ دی ایسے اسٹ" میں گولڈ سمتھ کو اٹھارویں صدی کا سب سے بڑا مضمون نگار اور نابغہ تسلیم کرتے ہوتے اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی شہرت ایڈیسن اور اسٹیل سے کہیں زیادہ ہے:

The man in black، A party at Vauxhall garden، National prejudices، On the Instability of world grandeur، The Silk Mercer اور Beau Tibbs at home گولڈ سمتھ کی معروف تخلیقات ہیں۔

Scanned by CamScanner

گولڈ سمتھ کے بعد اس دور کے نثر نگاروں میں جانسن کا نام بے حد اہم ہے اس کا ایک خاص اسلوبِ نگارش تھا جو "جانسنی اسلوب" کے نام سے مشہور ہوا۔ انشائیہ کی تعریف کے ضمن میں اگرچہ اس کا ایک فقرہ A loose sally of mind بے حد مشہور ہے مگر خود اس کے ایسیز ربط و توازن کی مثال پیش کرتے ہیں اور انشائیہ کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی ایسیز کے انتخابی مجموعوں میں جانسن کو بہت کم جگہ دی گئی ہے جانسن کی شہرت میں اس کے پرشکوہ اسلوب کو خاص اہمیت حاصل ہے حالانکہ انشائیہ کے لئے عموماً بے تکلف اسلوب کی سفارش کی جاتی ہے۔ بہرحال جانسن اپنے دور کا منفرد نثر نگار تسلیم کیا گیا ہے۔

انگریزی ایسے کی تاریخ میں گولڈ سمتھ کے بعد لی ہنٹ، ولیم ہیزلٹ اور چارلس لیمب کے نام نمایاں اہمیت رکھتے ہیں۔ انگریزی انشائیہ کی حیات تو انہی انشائیہ نگاروں کی مرہونِ منت ہے۔ لی ہنٹ کو اگرچہ اپنے دور میں خاصی شہرت و مقبولیت حاصل رہی لیکن ہف واکر کے خیال میں ہنٹ اتنا عظیم Essayist نہیں ہو تا کہ دیر زندہ رہ سکے۔ اس کے افکار و خیالات گہرائی و گیرائی سے تہی ہیں۔ اس کے اسلوب میں بھی کوئی ایسی بات نہیں جو اس کی اہمیت میں اضافے کا باعث بنے۔ وہ کہتا ہے۔ "ہلکی شراب کی طرح ہلکے پھلکے ادب کا نشہ بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا"

The cat by the Fire، A few Thoughts on sleep

Getting up on cold Mornings، My books

اور windows لی ہنٹ کے نمائندہ انشائیے ہیں۔

ولیم ہیزلٹ اپنی بعض خوبیوں کی بنا پر انگریزی ادب میں درجۂ اول کا انشائیہ نگار شمار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے انشائیوں میں تلخی اور ترشی کی ایک لہر ہمیشہ جاری رہتی

ہے۔ مزید برآں اس کے مضامین میں دوسرے مصنفین کے فقرے جابجا ملتے ہیں۔ جو نہ صرف تحریر کی روانی کو متاثر کرتے ہیں بلکہ انشائی مزاج کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں چنانچہ اس کے بیشتر ایسے انشائیہ کے دائرہ سے خارج ہو جاتے ہیں۔

On going a Journey, on the ignorance of the learned, The Indian Jugglers

ہیزلٹ کے مشہور انشائیے ہیں۔

انگریزی انشائیہ کی حیاتِ نو میں چارلس لیمب کی اہمیت مسلم ہے۔ انیسویں صدی کے ربع اوّل میں چارلس لیمب کا نام سامنے آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اہمیت اختیار کر گیا کہ آج اسے انگریزی انشائیہ کا "شہزادہ" کہا جاتا ہے لیمب کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی خوش دلی ہے۔ جسے اس نے تحفے کے طور پر اپنے پڑھنے والوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے انشائیے صحیح معنوں میں اس کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ چونکہ اس کے انشائیے اس کی ذاتی پسند و ناپسند اور میلانات کے بارے میں انکشاف کرتے ہیں اس لیے اس کے انشائیوں کو شخصی personal کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس کے انشائیوں میں ایک حزنیہ لے بھی موجود ہوتی ہے اس کے انشائیوں کو محض حزنیہ نہیں کہا جا سکتا۔ لیمب کے چند ایک مشہور انشائیے حسبِ ذیل ہیں۔

In Praise of chimney-sweepers. The convales-cent, Poor relations Valentine's Day, Dream Children Detached Thoughts on book and Reading, اور Old China

اس حقیقت کے باوجود کہ لیمب، ہیزلٹ اور ہنٹ نے خالص ایسے کے
معیاری نمونے پیش کیے انیسویں صدی میں ایسے کی اصطلاح کی وسعت میں
کوئی خاص کمی محسوس نہیں ہوتی۔ میکالے ایسے کے نام پر تاریخی مضامین
لکھنے میں مصروف رہا۔ کارلائل، رسکن، نیومین اور آرنلڈ وغیرہ تاریخی و معاشی
جمالیاتی، مذہبی اور تنقیدی مضامین کو ایسے کے نام سے پیش کرتے رہتے۔ لیکن
خالص ایسے یعنی انشائیہ نگاری کی طرف مائل نہ ہوتے۔ اس دور میں خالص ایسے
کے حوالے سے لیمب کے بعد صرف اسٹیونسن کا نام ملتا ہے۔

Walking Tour، An Apology for Idlers
The Ideal House اور plea for gas Lamps
اسٹیونسن کے معروف انشائیے ہیں۔

انگریزی انشائیہ کا جدید دور جی۔ کے چیسٹرٹن، اے۔ جی۔ گارڈنر۔
رابرٹ لنڈ اور ورجینا وولف ایسے ناموں سے مزین ہے۔ یہ ادیب خالص انشائیہ
نگاروں کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ ان انشائیہ نگاروں کے انشائیے نکتہ
آفرینی، انکشاف ذات اور موضوع کے مخفی مفاہیم کی نقاب کشائی کے باعث
انگریزی انشائیہ کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

On the pleasures of no Longer Being
very young، A defance of Non sence
The chocolate Bus اور چیسٹرٹن کے A piece of a
The stu The Map، The Mouse، The Darkness
In praise اور The pleasures of Ignorance، Chalk

Mistakes رابرٹ لنڈ کے اور The death of the Moth
ورجینا وولف کا نمائندہ انشائیہ ہے۔

انگریزی ایسے کی یہ تاریخ بتاتی ہے کہ انگریزی میں ایسے کی اصطلاح کا غیر محتاط استعمال کیا گیا خصوصاً جان لاک، پوپ، میکالے اور آرنلڈ وغیرہ نے جس طرح اس اصطلاح کو استعمال کیا اس کا کوئی جواز نہ تھا۔ انگریزی کے جدید انشائیہ نگاروں نے جائز طور پر اپنے ایسیز کو پرسنل ایسے کی اصطلاح سے موسوم کیا کیونکہ ایسے کو دیگر انواع کے ایسیز سے الگ کرنے کے لئے یہی ایک طریقہ باقی تھا۔ اردو میں انشائیہ کی اصطلاح دراصل اسی پرسنل ایسے کے متبادل رائج کی گئی ہے۔ لہذا اس بات پر اصرار مناسب نہیں کہ ایسے کو وسعت یافتہ ایسے کے مترادف سمجھتے ہوئے اس کا اطلاق ہر قسم کے مضامین پر کر دیا جائے۔ وسعت یافتہ ایسے کے مترادف کے طور پر ہمارے پاس مضمون کی اصطلاح نہ صرف موجود ہے بلکہ مستعمل بھی ہے لہذا ایسے کو عمومی ایسے کی بجائے پرسنل ایسے کے مترادف سمجھنا ہی مناسب ہے کیونکہ اردو کے انشائیہ نگار اور انشائیہ کے نقاد اس باب میں متفق الرائے ہیں مثلاً پروفیسر نظیر صدیقی لکھتے ہیں۔

"ذاتی طور پر میں انشائیے کو ایسے کا نہیں بلکہ پرسنل ایسے کا مترادف سمجھتا ہوں"۔ [1]

انور سدید اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

انشائیہ کے اولین نقاد ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کو انگریزی ایسے کی اس نوع سے عبارت کرتے ہیں جسے پرسنل ایسے personal Essay کا عنوان دیا جاتا ہے [2]

---

[1] تاثرات و تعصبات ۔ نظیر صدیقی ۔ مدرسہ عالیہ ڈھاکا ۔ اول ۱۹۶۲ ص ۲۳۲

[2] فکر و خیال ۔ انور سدید ۔ مکتبہ اردو زبان سرگودھا ۔ اول ۱۹۸۱ ص ۲۳۷

جمیل آذر کا کہنا ہے۔

"انشائیہ انگریزی کے ان مضامین کا مرہونِ منت ہے جو پرسنل الیسیز Personal Essays کہلاتے ہیں" [1]

انشائیہ کے ضمن میں اب تک جو کچھ کہا گیا اس کا ملخص یہ ہے کہ چونکہ ایسے بے حد وسیع اصطلاح ہے جس میں ہر قسم کے مضامین کے سما جانے کی پوری گنجائش موجود ہے اور اردو میں "ایسے" کے مترادف "مضمون" کی اصطلاح پہلے سے مستعمل ہے مزید برآں اب انگریزی ادب میں بھی خالص ایسے یعنی انشائیہ کے لئے ایسے کی بجائے پرسنل ایسے کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انشائیہ کو عمومی مضامین سے الگ کرتے ہوئے اسے پرسنل ایسے کے مترادف سمجھا جاتے تاکہ ایسے کے غیر محتاط استعمال سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکے اور صرف انہی تحریروں کو انشائیہ کہا جاتے جو پرسنل ایسے یا خالص ایسے کے ذیل میں آئیں اور بقیہ تحریروں کے لئے حسب معمول مضمون کی اصطلاح استعمال ہوتی رہے جو عمومی ایسے کے متبادل ہے۔ ہم مختصراً انشائیہ کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ

انشائیہ وہ صنفِ نثر ہے جس میں مصنّف اپنے ذاتی تاثرات اور انفرادی تجربات بے تکلفی اور اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہے، اس صنف میں لکھنے والا موضوع کے حوالے سے ذہن میں در آنے والی دیگر باتوں کا ذکر بھی کرسکتا ہے تاہم موضوع سے انحراف نہیں کرتا نیز انشائیہ نگار موضوع کے چھپے ہوئے گوشوں پر روشنی ڈال کر قاری کو پر تحیر مسرت بہم پہنچاتا ہے۔

---

[1] اردو کے بہترین انشائیے۔ جمیل آذر۔ مکتبہ اردو زبان اوّل ۱۹۷۶ء، ص ۸

انشائیہ کی تعریف کے بعد انشائیہ کی پہچان کا مسئلہ بظاہر حل ہو جاتا ہے۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں بھی تفصیل سے اظہار خیال کیا جائے۔

انشائیہ کی ہیئت کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں

" انشائیے، افسانے، ڈرامے اور دیگر فنی صورتوں میں بھی لکھے جا سکتے ہیں اور لکھے جاتے رہے ہیں اور ان کا رشتہ کبھی ناول سے کبھی ڈرامے سے کبھی افسانے سے جا ملتا ہے درحالیکہ اپنے اپنے بنیادی رویّے کی وجہ سے نہ یہ ڈراما ہیں نہ افسانہ اور نہ ناول - صرف ان فارموں کو ایک جدا قسم کے رویّے کے لیے اختیار کر کے انشائیہ نگار نے اپنی تخلیق پیش کی ہے۔ انشائیے کی اپنی خارجی شکل نہیں ہے وہ یہ فارم دوسرے اصناف سے حاصل کرتا ہے۔ [1]

ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی " دوسرا کنارہ " کے دیباچہ میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے لکھتے ہیں۔

" انشائیہ کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہے حتیٰ کہ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اسے لازمی طور پر مضمون ہی کے اسلوب میں لکھا جائے " [2]

اِن بیانات سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ شاید انشائیہ کی اپنی کوئی انفرادی صنفی حیثیت نہیں حالانکہ ایسا نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض اوقات انشائیہ میں کہانی کا عنصر در آتا ہے مگر انشائیہ کہانی نہیں بننے پاتا۔ گاہے انشائیہ نگار مکالمے سے استفادہ کرتا ہے جس سے انشائیہ ڈرامہ کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے لیکن ڈرامہ نہیں بنتا۔ کبھی انشائیہ

---

[1] انشائیہ ایک بحث ۔ ڈاکٹر وحید قریشی - اوراق لاہور - مارچ اپریل ۱۹۷۲ء صـ ۲۶۹

[2] دوسرا کنارہ - وزیر آغا - مکتبہ اردو زبان سرگودھا - ۱۹۸۲ء صـ ۱۴

Scanned by CamScanner

نگار۔ سفرنامہ اور رپورتاژ کی تکنیک سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور کبھی طنز و مزاح سے کام لیتا ہے لیکن نہ تو انشائیہ کو سفرنامہ یا رپورتاژ بننے دیتا ہے اور نہ اسے طنزیہ یا مزاحیہ مضمون میں تبدیل ہونے دیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح بعض اوقات افسانہ، خاکہ یا ناول کے کسی ٹکڑے میں انشائیہ جھلک اُٹھتا ہے بعینہٖ انشائیہ میں ان اصناف کا عکس نظر آتا ہے۔ ورنہ انشائیہ مختلف اصناف کی تکنیک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھی اپنا ایک داخلی مزاج اور خارجی ہیئت رکھتا ہے۔ اردو میں انشائیے عموماً مضمون کی ہیئت میں لکھے جاتے رہے ہیں تاہم اسے مضمون کے مترادف نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ مضمون ایک خاص ترتیب اور توازن کا حامل ہوتا ہے۔ مضمون میں عموماً ایک تمہید ہوتی ہے جس میں موضوع کا تعارف کرایا جاتا ہے پھر اس کی خوبیاں یا خامیاں دلائل کے ساتھ واضح کی جاتی ہے اور آخر میں نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے اس کے برعکس انشائیہ مضمون نگاری کا ایک خاص انداز ہے جس میں تمہید ہوتی ہے نہ دلائل کا کوئی سلسلہ قائم کیا جاتا ہے اور نہ کسی قسم کا نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار موضوع کے بارے میں اپنے شخصی تجربات اور انفرادی تاثرات کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ اسکی شخصیت کا کوئی چھپا ہوا گوشہ قارئین پر منکشف ہو جاتا ہے اور قارئین انشائیہ کے موضوع کے بجائے انشائیہ نگار کی ذات میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

مزید برآں مضمون کڑی منصوبہ بندی کے تحت لکھا جاتا ہے اور لکھنے والا موضوع سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ جب کہ انشائیہ نگار انشائیہ میں فکری آزادہ روی کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے جسے ذہن کی آوارہ خرامی کا نام دیا گیا ہے لیکن انشائیہ کے ضمن میں ذہن کی آوارہ خرامی پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اسے انشائیہ کا لازمی جز سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ ذہن کی آوارہ خرامی انشائیہ نگاری کی ایک مخصوص صورت ہے لازمی عنصر نہیں۔ پھر ذہن کی آوارہ خرامی کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انشائیہ نگار موضوع کو مس کرنے کے بعد اطراف

اور جوانب میں نکل جائے اور گھر کا راستہ ہی بھول جاتے۔ آوارہ خرامی یا آزادہ روی کی تکنیک محض اس لیے استعمال کی جاتی ہے کہ اس سے انشائیہ کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے اور انشائیہ نگار کو موضوع کے حوالے سے جو دوسری اہم باتیں کہنا ہوتی ہیں وہ چلتے چلتے ان کی طرف اشارہ کر کے اپنے اصل موضوع پر آجاتا ہے۔ یوں جن خیالات و افکار کے اظہار کے لیے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہوتی ہے انھیں ایک پیراگراف میں سمیٹ لیا جاتا ہے ورنہ انشائیہ بھی موضوع سے اسی قدر مربوط اور متعلق ہوتا ہے جس قدر ایک مضمون ہو سکتا ہے مگر چونکہ مضمون میں موضوع سے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی جب کہ انشائیہ میں لمحہ بھر کے لیے اصل موضوع سے ہٹ کر ایسے ضمنی موضوعات پر اظہارِ خیال کیا جا سکتا ہے جو موضوع کے حوالے سے ذہن میں در آئے ہوں اس لحاظ سے انشائیہ کا ڈھانچہ مضمون کی بہ نسبت قدرے لچکدار اور ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے اور یہ اسی لچک کا نتیجہ ہے کہ انشائیہ کبھی کہانی کی حدود میں ڈھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور کبھی ڈرامہ اور سفرنامہ کی خصوصیات کو اپنے اندر سمیٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

انشائیہ کے سلسلے میں اختصار کو بے حد اہمیت حاصل ہے لیکن اس بارے میں بھی بعض اذہان میں خاصی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اختصار کا صرف یہی مطلب نہیں کہ انشائیہ دو چار صفحات پر مشتمل ہو۔ انشائیہ دو چار صفحات کا بھی ہو سکتا ہے اور دس بارہ صفحات پر بھی پھیل سکتا ہے اس چیز کا انحصار انشائیہ کے موضوع پر بھی ہے اور انشائیہ نگار کے علمی و ادبی پس منظر، مشاہدہ اور زندگی کے تجربات پر بھی۔ اگر انشائیہ نگار کا مطالعہ و مشاہدہ کم اور زندگی کے تجربات محدود ہیں تو انشائیہ سطحی اور گہرائی نہیں مختصر بھی ہوگا۔ کیونکہ ایسی صورت میں انشائیہ نگار کے پاس کہنے کی باتیں ہی کم ہوں گی۔ اس کے برعکس اگر انشائیہ نگار کا مطالعہ وسیع اور

تجربات گوناگوں ہوں تو انشائیہ کا موضوع اس کی ذات سے مس کرتے ہی پھیل کر بیکراں ہو جائے گا۔ ایسے میں اگر انشائیہ نگار اختصار یعنی کفایتِ لفظی سے کام لیتے ہوئے غیر ضروری تفاصیل سے گریز نہیں کرے گا تو انشائیہ طوالت کا شکار ہو کر دلچسپی کھو بیٹھے گا۔ سو اختصار کا اصل مطلب غیر ضروری تفاصیل سے گریز کرنا اور کفایتِ لفظی سے کام لیتے ہوئے دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے تاکہ انشائیہ غیر ضروری طوالت کا شکار ہو کر قاری کے لیے بوجھ نہ بن جائے۔ اگر کوئی تنقیدی یا تحقیقی مضمون طوالت کا شکار ہو جائے تو مضائقہ نہیں کہ ان مضامین کا مقصد قاری کو محظوظ کرنے سے زیادہ مستفیض کرنا ہوتا ہے اور قارئین اسی نقطۂ نظر سے ان مضامین کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن انشائیہ کا مقصد مستفیض کرنے سے زیادہ محظوظ کرنا ہوتا ہے لہٰذا انشائیہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ اختصار سے کام لے تاکہ انشائیہ اپنی دلچسپی نہ کھو بیٹھے کیونکہ انشائیہ میں دلچسپی کا عنصر نہ ہونا یا کم ہونا انشائیہ کی خامی ہے۔

بعض اوقات انشائیہ نگار دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے طنز و مزاح سے بھی کام لیتا ہے۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کا داخلہ نہ تو ممنوع ہے اور نہ ہی ناگزیر۔ یہ انشائیہ نگار کے مزاج اور اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ انشائیہ میں طنز و مزاح سے کام لیتا ہے یا کہ نہیں تاہم اسلوب کی ان صفات سے کام لیتے ہوئے یہ احتیاط لازمی ہے کہ اگر طنز سے کام لیا جائے تو طنز کی نشتریت کسی کی دل آزاری کا باعث نہ ہو اور اگر مزاح سے کام لیا جائے تو مزاح تہذیب و شائستگی کے دائرے سے نکل کر پھکڑپن کی حدود میں نہ لڑھک جائے کہ انشائیہ کا مقصد نہ کسی کی دل آزاری ہے اور نہ کسی کا مضحکہ اڑانا۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا۔

"ایک اچھے انشائیہ میں طنز کبھی مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ محض ایک سہارے کا کام دیتی ہے۔ اسی طرح انشائیہ کا خالق محض مزاح تک اپنی سعی کو محدود

نہیں رکھتا۔ کیونکہ مزاح سے سطحیت پیدا ہوتی ہے"[1]

موضوع کو نئے زاویے سے دیکھنا اور اسکی نئی جہات دریافت کرنا انشائیہ کا بنیادی وصف ہے۔ انشائیہ نگار تسلیم شدہ خوبیوں کے منفی پہلوؤں کی نقاب کشائی کرنے کے علاوہ تسلیم شدہ کمزوریوں کے ایسے مثبت پہلو بھی اجاگر کرتا ہے جو عموماً عام قارئین کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ انشائیہ نگار لازمی طور پر مسلمہ حقائق کے خلاف اور تسلیم شدہ کمزوریوں کے حق میں اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ دراصل انشائیہ نگار یکسانیت کے خلاف اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے اس مقصد کے لیے وہ عموماً نکتہ آفرینی سے کام لیتا ہے اور موضوع کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کرتا ہے جو قاری کے لیے خوشگوار مسرت کا باعث بنتے ہیں۔

اب تک انشائیہ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا وہ انشائیہ کے موجودہ تصوّر کے مطابق ضرور ہے مگر حتمی نہیں کیونکہ انشائیہ تاحال ارتقائی مراحل میں ہے۔ یوں بھی ادب میں کوئی بات حتمی نہیں ہوا کرتی۔ سرسید احمد خاں کے دور میں انشائیہ کا کوئی واضح تصور نہیں تھا چنانچہ سرسید اور ان کے رفقاء نے انگریزی ایسّے کی تقلید میں جو ایسیز لکھے وہ خالص ایسے کے ذیل میں نہیں آتے۔ اگرچہ سرسید کے بعض مضامین میں وہ غیر رسمی انداز اور موضوعیت موجود ہے جو انشائیہ کا وصف ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ سرسید کے دور میں انشائیہ کے بجائے مضمون نگاری کا رواج تھا۔ انشائے لطیف کے مصنفین کے شاعرانہ مضامین میں اسلوب کو نفسِ مضمون پر ترجیح دی جاتی تھی جب کہ انشائیہ کے لیے غیر رسمی اسلوب کی سفارش کی جاتی ہے البتہ انشائے لطیف کے انشا نگاروں کے ایسیز دورِ سرسید کے مقابلے میں خالص ایسّے سے زیادہ قریب ہیں اور ان میں کہیں کہیں موضوعیت کے علاوہ مخفی مفاہیم کو گرفت میں لینے کا رویہ بھی موجود ہے

---

[1] خیال پارے۔ وزیر آغا۔ اکادمی پنجاب، لاہور اوّل ۱۹۶۱ء ص ۱۱

جوان کے مضامین کو انشائیے سے قریب تر کر دیتا ہے۔ طنز و مزاح نگاروں نے انگریزی ایسے کی تقلید میں جو طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے ان میں سے بعض خالص ایسے کی خصوصیات سے بھی متصف ہیں اور ان پر انشائیہ کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر سبھی طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کو انشائیہ کہنا درست نہیں کیونکہ طنز و مزاح نگار کا منصب انشائیہ نگار کے منصب سے متصادم ہے اور اردو انشائیہ کے مکاتبِ فکر میں اختلاف کا ایک سبب انشائیہ میں طنز و مزاح کی موجودگی اور عدم موجودگی بھی ہے۔ اختلاف کا دوسرا بڑا سبب انشائیہ کو پرسنل ایسے تک محدود کرنے سے متعلق ہے۔ وضاحت کے لیے جدید انشائیہ نگاروں کے تصورِ انشائیہ پر مختصر اً روشنی ڈالی جاتی ہے

ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کو ایسی تحریر قرار دیتے ہیں جس کا مقصد تصویر کا دوسرا رخ دکھا کر قاری کو تکرار کے حصار سے لحظہ بھر کے لیے آزادی دلانا ہے۔ ان کے خیال میں انشائیہ کا بنیادی وصف موضوع کے چھپے ہوئے گوشوں کو منظرِ عام پر لانا ہے۔ وہ نکتہ آفرینی پر زور دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انشائیہ نگار موضوع کو مختلف زاویوں سے الٹ پلٹ کر دیکھے۔ ان کا طریق کار انگریزی کے جدید انشائیہ نگاروں خصوصاً جی۔ کے چیسٹرٹن سے قریبی مشابہت رکھتا ہے جس کے ہاں موضوع کے مخفی مفاہیم کو گرفت میں لینے کا رویہ خاصا توانا ہے۔ اے۔ جی۔ گارڈنر اور رابرٹ لنڈ کے انشائیوں کا بھی یہی انداز ہے۔ چونکہ انگریزی کے ان انشائیہ نگاروں کے انشائیے (ایسے) انگریزی کے عمومی ایسے سے مختلف ہیں اس لیے ان انشائیہ نگاروں نے اپنے انشائیوں کو پرسنل ایسے کا نام دیا ہے یہی وجہ ہے کہ وزیر آغا انشائیہ کو پرسنل ایسے کے مترادف قرار دیتے ہوئے اسے عمومی ایسے پر چسپاں کرنے کے خلاف ہیں۔

نظیر صدیقی کے مزاج میں طنز اتنی زیادہ ہے کہ وہ اپنے تنقیدی مضامین میں بھی اس سے نجات نہیں پا سکے۔ انھیں خود بھی اس کا احساس ہے۔

Scanned by CamScanner

"شہرت کی خاطر" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"میں جن حالات و حوادث سے گزر تا رہا ہوں ان کے اثر سے میری زندگی بڑی حد تک غم و غصہ کا شکار رہی ہے۔ یہی غم و غصہ میری شاعری اور میرے انشائیوں کے محرکات رہے ہیں۔ میری شاعری کا محرک غم ہے اور میرے انشائیوں کا محرک غصہ۔ یہی وجہ ہے کہ میرے انشائیوں میں مزاح سے زیادہ طنز کا عنصر نمایاں ہے۔" [1]

نظیر صدیقی نے غصہ کو اپنے انشائیوں کا محرک بتایا ہے درحالیکہ انشائیہ نگار کا رویہ دوستانہ ہونا چاہیے کیونکہ غصہ کی حالت میں شگفتگی کا عنصر مفقود ہو جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انشائیہ نگاری کو مزاح نگاری یا طنز نگاری کے مترادف نہیں سمجھنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھیں اس بات پر بھی اصرار ہے کہ چونکہ طنز و مزاح اصنافِ ادب نہیں بلکہ اوصافِ ادب ہیں اس لیے ایک ادیب وصف کے لحاظ سے طنز نگار ہوتے ہوتے بھی صنف کے اعتبار سے انشائیہ نگار ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں وہ برنارڈ شا کی مثال دیتے ہیں جو اصنافِ ادب کے اعتبار سے ناول نگار اور ڈرامہ نگار ہے اور اوصاف ادب کے حوالے سے طنز نگار۔ لہذا انھیں اصرار ہے کہ وصف کے لحاظ سے انھیں بے شک طنز نگار کہا جاتے لیکن چونکہ وہ انشائیہ میں اظہار خیال کرتے ہیں اس لیے انھیں صنف کے اعتبار سے انشائیہ نگار تسلیم کیا جاتے حالانکہ وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں کہ طنز نگار کا مقصد معاشرتی ناہمواریوں اور قباحتوں کی نشاندہی اور ان کی اصلاح ہے جب کہ مزاح نگار عموماً ناہمواریوں سے محظوظ ہوتا ہے

---

[1] شہرت کی خاطر۔ نظیر صدیقی ص ۱۲

اور ان پر قہقہہ لگاتا ہے۔ انشائیہ نگار نہ تو معاشرے کی اصلاح کا دعویدار ہوتا ہے نہ قاری کو ہنسنے اور قہقہہ لگانے پر مائل کرتا ہے۔ اس کا کام تو شگفتہ انداز میں موضوع کے چھپے ہوئے گوشوں سے پردہ سرکا کر قاری کو مسرت آمیز تحیّر سے دوچار کرنا ہے۔ ایسا کرتے ہوتے وہ طنز و مزاح کے اوصاف سے بھی کام لے سکتا ہے لیکن اپنی سعی طنز یا مزاح تک محدود نہیں رکھتا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے طنز یا مزاح انشائیہ کے داخلی مزاج پر حاوی ہو کر اسے طنزیہ یا مزاحیہ مضمون بنا دے گا۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں میں عموماً یہی صورتِ حال سامنے آتی ہے۔

یہی حال مشکور حسین یادؔ کا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "دشنام کے آئینے" اولاً طنزیہ مضامین کی حیثیت سے پیش کی تھی اور کتاب مذکورہ کے دیباچے میں اس کی صراحت بھی کی تھی کہ چونکہ یہ مضامین طنز کی واضح خواہش کے زیرِ اثر لکھے گئے ہیں لہذا انھیں انشائیہ نہیں کہا جا سکتا۔ لکھتے ہیں۔

"دشنام کے آئینے" میرے طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے ایک طرح سے میں ان مضامین کو طنزیہ انشائیے بھی کہہ سکتا ہوں۔ لیکن چونکہ انشائیے کے بارے میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انشائیہ نگار جس وقت انشائیہ تحریر کرنے بیٹھتا ہے تو اس وقت اس کے ذہن میں موضوع کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے میں اپنے ان مضامین کو انشائیہ کہنے کے لیے تیار نہیں کیونکہ یہ مضامین لکھتے وقت میرے ذہن میں طنز لکھنے کی واضح خواہش اور تصور موجود تھا۔ میں سمجھتا ہوں غیر ارادی طور پر طنز، مزاح، فلسفہ وغیرہ انشائیہ میں شامل ہو جاتے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر انشائیہ تحریر کرنے سے قبل اس قسم کی کوئی چیز ذہن میں موجود ہے تو پھر ایسی تحریر کو ہم انشائیہ نہیں کہہ سکتے۔[1]

---

[1] "دشنام کے آئینے"، مشکور حسین یاد، نسیم بکڈپو، لاہور اول، ۱۹۷۵ء ص۷۔

مگر اب وہ اپنے اس موقف پر قائم نہیں رہے۔ حال ہی میں ان کی ایک کتاب "ممکناتِ انشائیہ" منظرِ عام پر آئی ہے جس میں انشائیہ کے بارے میں ان کے متعدد مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کے ایک مضمون میں انھوں نے "دشنام کے آئینے" کے طنزیہ مضامین کو بھی انشائیہ قرار دے ڈالا ہے۔ لکھتے ہیں: "ابھی تک میرے انشائیوں کے دو مجموعے چھپے ہیں۔ ایک "دشنام کے آئینے میں" اور دوسرا "جوہر اندیشہ"۔ [1]

اِن کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انشائیہ کے باب میں ان کا کوئی ایک موقف نہیں۔ ایک وقت میں وہ اپنے جن مضامین کو طنزیہ کہتے ہیں دوسرے وقت میں انہی کو انشائیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ انشائیہ کے بارے میں ان کے کچھ اور بیانات ملاحظہ ہوں۔

"میں جس وقت انشائیہ کو ام الاصناف کہتا ہوں اس سے عموماً میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے نثری ادب کی جتنی بھی اصناف ظہور میں آتی ہیں ان کا منبع و مصدر انشائیہ ہے۔ گویا ام الاصناف کہنے سے میرا مطلب زیادہ تر انشائیے کے ماضی سے ہوتا ہے"۔ [2]

اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں: "سچ پوچھیے تو انشائیہ کا نہ کوئی ماضی ہوتا ہے اور نہ مستقبل۔ یہ تو خالصتاً حال کی چیز ہے"۔ [3]

---

[1] ممکناتِ انشائیہ۔ مشکور حسین یاد۔ پولیمر پبلیکیشنز لاہور اوّل۔ ۱۹۸۳ء ص ۱۵۲

[2] ایضاً ص ۵۷

[3] ایضاً ص ۵۹

ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ابھی تو اردو میں انشائیہ نے پوری طرح جنم بھی نہیں لیا۔ باقاعدہ انشائیہ لکھنے والوں کی تعداد ایک دو سے زیادہ نہیں وہ کی بات بھی میں نے انکسار میں کہی ہے" [1]

ایک طرف وہ انشائیہ کو ام الاصناف کہتے ہیں اور دوسری طرف اردو میں اس کے وجود کے بارے میں بھی متشکک ہیں۔ اس صورتِ حال نے انشائیہ فہمی میں جو رکاوٹیں پیدا کی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ یوں لگتا ہے مسئلہ انشائیہ کا نہیں، ذاتی پسند و ناپسند کا ہے جن لوگوں کی تربیت طنز و مزاح کے زیر اثر ہوتی ہے وہ انشائیہ میں طنز و مزاح کی فراوانی پر اصرار کرتے ہیں حالانکہ طنز و مزاح انشائیہ کے لیے ناگزیر ہے نہ ممنوع۔ یہ انشائیہ لکھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ انشائیہ میں طنز و مزاح سے کام لیتا ہے یا نہیں۔ البتہ طنز و مزاح سے کام لیتے ہوتے توازن و اعتدال برقرار رہنا چاہیے۔ نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد نے ایسے انشائیے بھی لکھے ہیں جو طنز و مزاح کی موجودگی کے باوجود انشائیے ہیں لیکن جب وہ اپنے طنزیہ مضامین کو بھی انشائیہ بنوانے پر اصرار کرتے ہیں تو مسئلہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ مشکور حسین یاد تو اسے طنز و مزاح ہی نہیں ہر قسم کے ایسے پر محیط کر کے اس کی انفرادیت ختم کرنے پر تلے ہوتے ہیں "ممکنات انشائیہ" میں لکھتے ہیں۔

اگر ہم نے ایسے کا اردو ترجمہ انشائیہ کیا ہے اور لغوی اعتبار سے بہتر کیا ہے تو اس ترجمے کو یعنی لفظ انشائیہ کو پورے ایسے کا ترجمہ ہی رہنے دیجیے اور اس کو پرسنل ایسے تک محدود نہ کیجیے" [2]

---

[1] ممکنات انشائیہ ۔ مشکور حسین یاد ۔ ص ۱۲۴
[2] ایضاً ص ۵۴

مشکور حسین یاد کے مقابلے میں نظیر صدیقی کا رویّہ قدرے معقول ہے کہ وہ انشائیہ میں محض طنز و مزاح کی وکالت کرتے ہیں اسے سارے ایسے پر محیط نہیں کرتے۔ مشکور حسین یاد نے "دشنام کے آئینے" کو طنزیہ مضامین اور "جوہر اندیشہ" کو انشائیہ کے نام سے پیش کر کے جس حقیقت پسندی کا ثبوت دیا تھا اگر وہ اس پر قائم رہتے اور اپنے طنزیہ مضامین کو انشائیہ منوانے کی بجائے اچھے انشائیے لکھنے کی طرف توجہ دیتے تو انشائیہ کی صنف ادبی سیاست کا شکار ہونے کی بجائے اب تک ترقی کی کئی منازل طے کر چکی ہوتی اور جس طرح وزیر آغا کے انداز کو پسند کرنے والے انشائیہ نگار موجود ہیں۔ مشکور حسین یاد کے انداز کو پذیرائی بخشنے والے انشائیہ نگار بھی منظرِ عام پر آتے۔

میری رائے میں انشائیہ کی اصطلاح پرسنل ایسّے کے مترادف ہے اور اسے سارے ایسّے پر محیط کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اگر انگریزی دان ایسیز کے انتخابی مجموعوں میں ہر قسم کے ایسے شامل کرنے کی غلطی کرتے رہے ہیں تو ضروری نہیں کہ اردو دان بھی ان کی پیروی کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی میں بھی پرسنل ایسّے کو دیگر اقسام کے ایسیز سے علیحدہ چیز سمجھا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انگریزی میں کریٹیکل ایسّے، ہسٹاریکل ایسّے، فلاسفیکل ایسّے۔ پیریاڈیکل ایسّے اور پرسنل ایسّے جیسی اصطلاحیں مروّج نہ ہوتیں۔ چونکہ اردو میں ایسّے کی متبادل اصطلاح مضمون موجود ہے اور اتنی ہی وسیع ہے جتنی انگریزی ایسّے کی اصطلاح اس لیے مناسب یہی ہے کہ انشائیہ کو پرسنل ایسّے کے مترادف ہی رہنے دیا جاتے اور اسے سارے ایسّے پر محیط کرنے کی سفارش نہ کی جاتے۔

اب تک کی بحث انشائیہ کی تعریف اور پہچان سے متعلق تھی۔ اب آیئے انشائیہ کی اصطلاح کی طرف۔ ڈاکٹر سلیم اختر "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کی چھٹی

مشکور حسین یاد کے مقابلے میں نظیر صدیقی کا رویّہ قدرے معقول ہے کہ وہ انشائیہ میں محض طنز و مزاح کی وکالت کرتے ہیں اسے سارے ایسے پر محیط نہیں کرتے۔ مشکور حسین یاد نے "دشنام کے آئینے" کو طنزیہ مضامین اور "جوہر اندیشہ" کو انشائیہ کے نام سے پیش کر کے جس حقیقت پسندی کا ثبوت دیا تھا اگر وہ اس پر قائم رہتے اور اپنے طنزیہ مضامین کو انشائیہ منوانے کی بجائے اچھے انشائیے لکھنے کی طرف توجہ دیتے تو انشائیہ کی صنف ادبی سیاست کا شکار ہونے کی بجائے اب تک ترقی کی کئی منازل طے کر چکی ہوتی اور جس طرح وزیر آغا کے انداز کو پسند کرنے والے انشائیہ نگار موجود ہیں۔ مشکور حسین یاد کے انداز کو پذیرائی بخشنے والے انشائیہ نگار بھی منظرِ عام پر آتے۔

میری رائے میں انشائیہ کی اصطلاح پرسنل ایسّے کے مترادف ہے اور اسے سارے ایسّے پر محیط کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ اگر انگریزی دان ایسیز کے انتخابی مجموعوں میں ہر قسم کے ایسے شامل کرنے کی غلطی کرتے رہے ہیں تو ضروری نہیں کہ اردو دان بھی ان کی پیروی کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی میں بھی پرسنل ایسّے کو دیگر اقسام کے ایسیز سے علیحدہ چیز سمجھا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انگریزی میں کرٹیکل ایسّے، ہسٹاریکل ایسّے، فلاسفیکل ایسّے۔ پیریاڈیکل ایسّے اور پرسنل ایسّے جیسی اصطلاحیں مروّج نہ ہوتیں۔ چونکہ اردو میں ایسّے کی متبادل اصطلاح مضمون موجود ہے اور اتنی ہی وسیع ہے جتنی انگریزی ایسّے کی اصطلاح اس لیے مناسب یہی ہے کہ انشائیہ کو پرسنل ایسّے کے مترادف ہی رہنے دیا جاتے اور اسے سارے ایسّے پر محیط کرنے کی سفارش نہ کی جاتے۔

اب تک کی بحث انشائیہ کی تعریف اور پہچان سے متعلق تھی۔ اب آیئے انشائیہ کی اصطلاح کی طرف۔ ڈاکٹر سلیم اختر "اردو اَدب کی مختصر ترین تاریخ" کی چھٹی

اشاعت میں لکھتے ہیں۔

"جہاں تک انشائیہ کی اصطلاح کا تعلق ہے تو لفظ انشائیہ بذاتِ خود خاصہ پرانا ہے۔ مثلاً مولانا محمد حسین آزاد کے مکاتیب کے مجموعے "مکتوباتِ آزاد" (ص۔ ۱۰۲) میں ادب میں ناٹک کی اہمیت کے ضمن میں یہ سطریں ملتی ہیں "اس کے لکھنے والے انشاپرداز شمار ہوتے ہیں کیونکہ فنونِ انشائیہ کا ادا کرنا بھی ایک جزوِ اعظم انشا کا ہے" یہی نہیں کہ محمد حسین آزاد نے سب سے پہلے لفظِ انشائیہ وضع کیا بلکہ سب سے پہلا انشائیہ بھی آزاد ہی نے لکھا ہے۔ چنانچہ آغا محمد باقر کی مرتبہ "مقالاتِ محمد حسین" (جلد۔ دوم) میں ناموری کا مندر (ص۔ ۳۸۸) ملتا ہے جس کے بارے میں مرتب نے یہ وضاحت کی ہے۔ یہ کسی انشائیہ کا ترجمہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جس زمانہ (۱۹۵۷ء) میں ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریریں ادبِ لطیف میں نثرِ لطیف، لطیف پارہ یا خیالیے کے عنوان تلے چھپتی تھیں اور وہ ہنوز لفظ انشائیہ سے ناآشنا تھے تو اس سے کہیں پہلے ۱۹۴۴ء میں سید علی اکبر قاصد کے انشائیوں کا مجموعہ "ترنگ" پٹنہ سے شائع ہو چکا تھا۔ اس کا تعارف کلیم الدین احمد اور دیباچہ اختر اورینوی نے لکھا تھا۔ ۱۰۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب گیارہ انشائیوں پر مشتمل ہے۔ اختر اورینوی نے اپنے دیباچہ کا آغاز ان سطور سے کیا ہے۔ "اردو ادب میں انشائیوں Essays اور خاکوں کی بڑی کمی ہے۔ کبھی کبھار کوئی اچھا سا انشائیہ پرچوں میں نکل آتا ہے تو دو گھڑی کے لیے جی بہل جاتا ہے۔" ان دو ٹوک شواہد کی روشنی میں ڈاکٹر وزیر آغا کو کیسے اس

Scanned by CamScanner

صنف یا اصطلاح کا موجد تسلیم کیا جا سکتا ہے۔" [1]

ڈاکٹر وزیر آغا نے اس صنف کا آغاز کیا یا نہیں؟ اس کا جواب اپنے مقام پر دینے کی کوشش کی جائے گی۔ سر دست انشائیہ کی اصطلاح زیر بحث ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی اس بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ انشائیہ کا لفظ بذات خود خاصا قدیم ہے۔ اولاً یہ لفظ لغت کی بعض کتب میں موجود ہے لیکن وہاں یہ لفظ انشا کے معنی میں آیا ہے۔ محمد حسین آزاد نے بھی اپنے مکتوب میں انشائیہ کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں کیا جو آج کل اس اصطلاح سے مخصوص ہیں۔ آزاد نے یہ لفظ انشا پردازی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ انشائیہ کا لفظ قواعد کی دیگر کتابوں میں بھی موجود ہے مثلاً پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی اپنی مشہور کتاب "کیفیہ" میں لکھتے ہیں۔

"کلام مرتب کرنے کا عمل انشا کہلاتا ہے ـــــ کلام یا خبریہ ہوگا یا انشائیہ۔ اس کو خارجی اور داخلی سمجھ لیجیے۔" [2]

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ آزاد یا کیفی انشائیہ کی اصطلاح سے واقف تھے البتہ ان کی یہ رائے قابل قبول ہے کہ انشائیہ کی اصطلاح پہلے پہل اختر اورینوی کے اس دیباچہ میں نظر آتی ہے جو انھوں نے علی اکبر قاصد کی کتاب "ترنگ" کے لیے لکھا تھا۔ یہ دیباچہ مضمون کی صورت میں ان کی کتاب "تحقیق و تنقید" میں شامل ہے۔ اس مضمون سے اگرچہ یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ انشائیہ کی اصطلاح انھوں نے ایسے کے لیے پہلی بار استعمال کی ہے لیکن چونکہ اس سے قبل کسی تحریر میں ایسے کے لیے انشائیہ کی اصطلاح نظر نہیں آتی اس لیے سر دست اس اصطلاح کی نامزدگی میں اختر اورینوی کا نام ہی اہمیت رکھتا ہے لہٰذا یہ بات درست

---

[1] اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔ سلیم اختر۔ سنگ میل پبلیکیشنز۔ لاہور۔ ششم ۱۹۸۱ء ص ۳۱۸-۳۱۹

[2] کیفیہ۔ برجوہن دتاتریہ کیفی۔ مکتبہ معین الادب لاہور۔ دوم ۱۹۵۰ء ص ۱۹۶ اوّل ۱۹۴۲ء

ہے کہ انشائیہ کی اصطلاح ڈاکٹر وزیر آغا سے پہلے اختر اورینوی کے ہاں نظر آتی ہے خصوصاً اس لیے بھی کہ انھوں نے انشائیہ کی صنف سے مکمل آگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"اردو دنیا میں مضمون نگاروں کی کمی نہیں رہی۔ حالی، شبلی، شرر اور حسن نظامی کے مضامین و مقالے تو کثرت ہیں اور ان میں سے بعض مضامین میں انشائیہ کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے تاہم خالص انشائیے نایاب ہی ہیں۔" [1]

انشائیہ کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"انشائیوں میں چند خصوصیات ہوتی ہیں۔ انفرادی نقطۂ نظر کے جلوے انشائیوں میں ضرور ہونے چاہئیں یعنی موضوع کے متعلق ذاتی اور نجی ردِ عمل کو ایک خاص انوکھے پن کے ساتھ پیش کرنا ضروری ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ انشائیہ نویسی بڑے عیش و آرام کی مزے دار فلسفہ طرازی ہے...... کہنے والوں نے یہ بھی کہا ہے کہ انشائیہ دماغ کی آزاد ترنگ ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کسی موضوعِ سخن پر باضابطہ قسم کا مدلل اور منطقی مضمون پیش نہیں کیا جاتا۔ بلکہ بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور کبھی بے بات کی بات پر بھی بڑے فلسفیانہ انداز میں خامہ فرسائی کی جاتی ہے۔ خیالات کو تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ بغیر پاسبانی کے آوارہ ہو جائیں۔ خیالات عزمِ سفر نہیں کرتے اور نہ ہی منزلیں مارتے چلے جاتے ہیں تاکہ ایک خاص منزلِ مقصود تک پہنچیں۔ بلکہ انشائیوں میں خیالات کی گلگشت ہوتی ہے۔" [2]

---

[1] تحقیق و تنقید۔ اختر اورینوی۔ شاد بکڈپو۔ پٹنہ سن ندارد ص ۱۱۵

[2] ایضاً "انشائیہ ص ۱۱۷ – ۱۱۸"

اِن شواہد کی روشنی میں یہ دعویٰ بجا ہے کہ انشائیہ کی اصطلاح ایسّے کے معنی میں پہلے پہل اختر اوریتوی کے ہاں ملتی ہے۔ یہ الگ بات کہ جس کتاب کا یہ دیباچہ ہے اس کی نگارشات پر انشائیہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جن مضامین کو انشائیہ کہا گیا ہے وہ سرے سے انشائیے ہیں ہی نہیں بلکہ ان کا تو ادبی معیار ہی پست ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وزیر آغا کو انشائیہ کی اصطلاح وضع کرنے کا دعویٰ ہے خود وزیر آغا کا بیان ہے

"کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اُردو میں ایسّے کے لیے انشائیہ کا لفظ رائج کیا گیا۔ چونکہ اردو میں انشائیہ کی کوئی خاص روایت موجود نہ تھی اور قارئین نے ایسّے کو طنزیہ و مزاحیہ مضامین سے الگ اور جدا کرنے ضرورت محسوس نہ کی تھی اس لیے جب "ادب لطیف" میں ایسّے کو پیش کرنے کی تحریک کا آغاز ہوا تو میرے اور میرزا ادیب صاحب کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ایسّے کو کیا نام دیا جائے تاکہ یہ دوسری اصناف سے الگ نظر آ سکے۔ کچھ عرصہ کے لیے ہم نے لطیف پارہ کی ترکیب استعمال کی لیکن یہ رائج سکّہ نہ بن سکی پھر ہم نے انشائے لطیف کی ترکیب کا احیا کیا لیکن مصیبت یہ تھی انشائے لطیف کے ساتھ فنگوریت چپک کر رہ گئی تھی چنانچہ اسے بھی ترک کرنا پڑا۔ اسی دوران میں نے کسی ادبی رسالے میں انشائیہ کا لفظ پڑھا۔ جو ایسّے کے لیے تو نہیں لیکن انشا کے کسی ٹکڑے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ میرزا ادیب صاحب سے میں نے اس کا ذکر کیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ اس کے بعد ادبِ لطیف میں ایسّے کے لیے انشا کا لفظ ہی استعمال ہوتا رہا اور خوش قسمتی سے یہ مقبول بھی ہو گیا" [1]

---

[1] کچھ اردو انشائیہ کے بارے میں۔ وزیر آغا۔ اردو زبان سرگودھا۔ سالنامہ ۱۹۷۶ء، ص۱۷۳

ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ تحریر اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں انشائیہ کی اصطلاح وضع کرنے کا دعویٰ نہیں، البتہ انھیں یہ دعویٰ ضرور ہے کہ انھوں نے انشائیہ کی اصطلاح کو عام کرنے کے علاوہ انشائیہ کے خدوخال واضح کیے اور انشائیہ نگاری کو تحریک بنا کر اسے بطور ایک صنفِ ادب اعتبار بخشا اور غالباً ان کا یہ دعویٰ بے جا بھی نہیں کیونکہ بیشتر نقاد اور ادیب اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں ڈاکٹر سلیم اختر نے "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" کی چھٹی اشاعت سے انشائیہ کے بارے میں اپنے موقف میں جو تبدیلی پیدا کی ہے اس پر کوئی تبصرہ کیے بغیر ان کی وہ رائے نقل کی جاتی ہے جو متذکرہ تاریخ کی پانچویں اشاعت میں شامل ہے کیونکہ میرے نزدیک ان کی یہی رائے قرینِ صحت ہے۔ ان کا کہنا ہے۔

"انشائیہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس کے بارے میں ابھی تک ہمارے ہاں تنقیدی مباحث طے نہیں پا سکے۔ گو سر سید احمد خاں نے "تہذیب الاخلاق" میں انگریزی انشائیہ نگاروں سٹیل اور ایڈیسن کے انداز پر Essay لکھنے کی کوشش کی لیکن وہ مضامین ہیں انشائیہ نہیں۔ اردو ناقدین میں اب تک یہ بحث جاری ہے کہ کیا سر سید کو اردو کا اولین انشائیہ نگار قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ایسی بحثوں اور تکنیک پر لکھے گئے دیگر مضامین کا کم از کم یہ نتیجہ تو برآمد ہوا کہ بطور ایک صنف انشائیہ کا نام سنجیدگی سے لیا جانے لگا۔ یوں دیکھا جائے تو ناقدین کی دلچسپی ہی انشائیہ کے فروغ کا باعث بنتی ہے۔

اس ضمن میں سرِ فہرست ڈاکٹر وزیر آغا (خیال پارے۔ چوری سے یاری تک) ہیں جنھوں نے اپنی تنقیدی تحریروں اور انشائیوں کے علاوہ "ادبی دنیا" اور بعد ازاں "اوراق" میں انشائیہ نگاری کے لیے باقاعدہ تحریک شروع کی۔ حتیٰ کہ "اوراق" کے ایک اداریے میں معروف لکھنے والوں کو انشائیہ

نگاری کی دعوت دی۔ الغرض انشائیہ کے فروغ میں ڈاکٹر وزیر آغا اپنے وجود میں ایک تحریک ہیں۔[1]

میرزا ادیب انشائیہ کے ضمن میں وزیر آغا کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"لائٹ ایسے اردو میں بہت ہی کم لکھے گئے ہیں ۔ وزیر آغا کا نام اس سلسلے میں سب سے بلند اور نمایاں ہے"۔[2]

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں

"ایک جدید صنفِ نثر کی حیثیت سے اردو انشائیے کو ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنایا انھوں نے سب سے پہلے شعوری طور پر ایسے انشائیے لکھے جو جدید انشائیے کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کے دو مجموعے "خیال پارے اور چوری سے یاری تک" شائع ہو چکے ہیں۔ انشائیے کی ترویج میں اِن کی کوششوں کو بڑا دخل ہے"۔[3]

مشکور حسین یاد بھی انشائیہ کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں وزیر آغا کی کوششوں کے معترف ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"مجھے اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے ۱۹۵۸-۵۹ء کے بعد سے باقاعدہ انشائیہ نگاری کی تحریک چلائی خود انشائیے لکھے اور دوسروں کو انشائیے لکھنے پر اکسایا۔ اپنے ادبی جریدہ اوراق میں وقتاً فوقتاً انشائیہ کے خدوخال کو قارئین پر واضح کرنے کی کوشش کی"[4]

۱؎ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔ ڈاکٹر سلیم اختر۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور پنجم ۱۹۷۸ء ص ۲۲۸

۲؎ گذشتہ دس سال کی نمایاں نثری تخلیقات (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء) مطبوعہ روزنامہ امروز، لاہور دہ سالہ نمبر ۲۳۔ مارچ ۱۹۵۸ء ص ۹۳

۳؎ اصنافِ ادب۔ رفیع الدین ہاشمی ص ۱۶۰ (۴) ممکناتِ انشائیہ۔ مشکور حسین یاد ص ۱۴۱

اسی مضمون میں آگے چل کر پھر اس حقیقت کو دہراتے ہیں کہ وزیر آغا نے انشائیہ نگاری کی باقاعدہ تحریک چلائی۔ لکھتے ہیں۔

"جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اردو میں جس شخص نے باقاعدہ انشائیہ نگاری کی تحریک چلائی وہ ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ ان کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ "خیال پارے" ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "چوری سے یاری تک" ۱۹۶۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ "خیال پارے" پڑھ کر مجھے احساس ہوا تھا جیسے آغا صاحب نے اسلوب کے اعتبار سے انگریزی ایسے اور وہ بھی پرسنل ایسے کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔" ؎۱

جمیل آذر کا کہنا ہے۔

"ڈاکٹر وزیر آغا پہلے ادیب ہیں جنھوں نے انشائیہ کے عناصرِ ترکیبی اور اس روح کو دریافت کیا جو انگریزی کے بلند پایہ انشائیوں کے اندر برقی رو کی طرح جاری اور ساری ہے۔ انھوں نے ان مقتضیات کو اردو انشائیہ کا جزو لاینفک بنا کر نہ صرف انشائیے لکھے بلکہ اپنے تنقیدی مضامین لکھ کر اس صنفِ ادب کے واضح نقوش کی نشان دہی کی" ؎۲

ممتاز مزاح نگار احمد جمال پاشا کا خیال ہے۔

"ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا مجموعہ "خیال پارے" اردو ادب میں نہ صرف انشائیوں کا اولین مجموعہ ہے بلکہ اردو ادب میں اسکی اشاعت سے انشائیہ کی اصطلاح عام ہوتی ہے اور اس سے انشائیہ کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے" ؎۳

؎۱ ممکنات انشائیہ۔ مشکور حسین یاد ص ۱۵۰

؎۲ اردو کے بہترین انشائیے۔ جمیل آذر۔ مکتبہ اردو زبان سرگودھا اوّل ۱۹۷۲ء ص ۱

؎۳ انشائیہ کی اصطلاح۔ احمد جمال پاشا اردو زبان سرگودھا اپریل ۱۹۸۳ء ص ۱۱

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ اردو انشائیہ کی ترویج و ترقی میں وزیر آغا کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف خود انشائیے لکھے اور دوسروں کو انشائیے لکھنے پر اکسایا بلکہ اس صنف ادب کی حدود متعین کرنے اور اس کے خدوخال کی وضاحت کے لیے مسلسل مضامین بھی لکھے۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج انشائیہ اپنی منفرد حیثیت میں پہچانا جانے لگا ہے ورنہ اس سے قبل انشائیہ سنجیدہ اور غیر سنجیدہ مضامین کے انبار تلے دبا ہوا تھا۔ اردو انشائیہ کی بازیافت اور شناخت وزیر آغا ہی کی مرہونِ منت ہے اور اس حوالے سے وہ اردو انشائیہ کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے

اردو کا پہلا انشائیہ نگار کون ہے؟ یہ سوال بھی خاصا اہم اور متنازعہ فیہ ہے جس کے لئے اردو کے نثری سرمائے کا انشائیہ کے نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا ضروری ہے لہٰذا اس سوال کے جواب کے لیے اردو انشائیہ کے بنیادی اوصاف کی وضاحت کے بعد اردو کے نثری سرمایہ میں انشائیہ کی تلاش کا مسئلہ درپیش ہے۔ انشائیہ کی تلاش کے لیے سب سے پہلے اردو کی قدیم انشاپردازی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ کیونکہ بعض لوگوں کے خیال میں انشائیہ کا انشاپردازی سے بھی تعلق ہے۔

دوسرا باب

انشائیہ اور انشا پردازی

"انشا پردازی وہ فن ہے جسے سیکھ کر ایک شخص اپنے خیالات کو عمدہ اور موثر الفاظ کا رنگین اور خوشنما جامہ پہنا سکتا ہے۔ جس طرح ایک مصور تصویر کو مختلف رنگوں سے سجا کر اسے خوشنما بنا دیتا ہے اسی طرح ایک انشا پرداز اپنے خیالات کو موثر انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ سامعین یا قارئین کے دل پر نقش ہو جاتے ہیں"۔ [1]

پروفیسر محمد مجیب انشا پردازی کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"انشا پردازی دوسرے فنون کی طرح ایک فن ہے جس میں الفاظ سے وہی کام لیا جاتا ہے جو مصوری میں رنگوں اور موسیقی میں سُروں سے"۔ [2]

مذکورہ بالا تعریفات کی روشنی میں ہر وہ تحریر انشا پردازی کے ذیل میں آجاتی ہے جس میں الفاظ کا صناعانہ استعمال ہو اور نفسِ مضمون کو عمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہو خواہ موضوع کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ حتیٰ کہ یہ تعریف نظم و نثر کی تخصیص بھی نہیں کرتی جس کی وجہ یہ ہے کہ اردو ادب میں انشا پردازی کی اصطلاح عربی و فارسی ادب کی اصطلاح "انشا" کے معنی میں بھی استعمال ہوتی رہی ہے اور جس طرح وہاں انشا کا لفظ لغوی طور پر نظم و نثر دونوں کو محیط ہے اسی طرح اردو میں بھی انشا پردازی کی اصطلاح ادبی تخلیق کے معنوں میں مستعمل رہی ہے مولانا محمد حسین آزاد نے "سخندانِ فارس" میں

---

[1] اردو انشا پردازی - عبداللہ قریشی - قومی کتب خانہ - لاہور - اوّل - ۱۹۸۱ء ص ۱

[2] انشا ادب اور ادیب، پروفیسر محمد مجیب - اردو گھر دہلی - اوّل ۱۹۴۴ء ص ۱۰

متعدد مواقع پر انشاپردازی کی اصطلاح کو شاعری کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ پانچویں لکچر بعنوان ”قدمائے فارس کے اصول نثر علی اور رسوم عرفی کے تحت لکھتے ہیں۔

”ستم رسیدہ جب کسی کے ظلم سے نالاں ہوتا تو کاغذی پیرہن پہن کر دربار میں فریادی آتا۔ دیکھو انشاپردازی نے کس رنگ سے خبر دی ہے۔

کاغذی جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد

زادۂ خاطرِ من ہمتا بدہی داد مرا [۱]

”رسم قدیم ہے کہ جب کسی کا دوالہ نکل جاتا ہے تو دوکان کے آگے کھڑا ہو جاتا اور بوق بجاتا ہے۔ انشاپردازی نے اس سے آگاہ کیا اور اس کے ساتھ یہ بھی جتایا کہ خراس یا پنچکی والے بھی بوق بجایا کرتے ہیں تاکہ اناج لانے والوں کو خبر ہو جاتے

آسیائے دہر خالی دیدم از جنس وفا

در جہاں بوقے بہ طرز آسیاباں می زنم [۲]

فردوسی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”اس کی انشاپردازی استعاروں سے رنگینی اور صنعتوں سے میناکاری نہیں مانگتی۔ صاف صاف شعر، سادہ سادہ لفظ، محاورہ کی باتیں، سلیس زبان قدرتی نہر میں چشمہ خداداد پانی کا بہتا چلا جا رہا ہے“ [۳]

دوسرے طبقے کے شعرا میں نظامی گنجوی کا ذکر کرتے ہوتے لکھتے ہیں۔

"نظامی گنجوی نے پانچ لاجواب مثنویاں اور بہت سے قصیدے لکھکر انشاپردازی میں نئے رنگ پیدا کئے اور تشبیہہ و استعارہ کو رنگینی کے ساتھ برتا" ۱ے

اگرچہ مندرجہ بالا امثال میں انشاپردازی کی اصطلاح شاعری اور انشاپرداز کی ترکیب شاعر کے لیے استعمال کی گئی ہے لیکن اردو ادب میں عموماً انشاپردازی کی اصطلاح نثرنگاری اور انشاپرداز کی اصطلاح نثر نگار کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے گوکہ اس ضمن میں بھی موضوع کو نظر انداز ہی کیا گیا اور ہر قسم کی نثری کاوشوں کے لیے انشاپردازی کی اصطلاح استعمال کی جاتی رہی ہے خواہ ان کا تعلق خطوط نویسی سے ہو یا داستان طرازی سے، حکایات سے ہو یا اخلاقیات سے ، تذکرہ و تنقید سے ہو یا تاریخ ولسانیات سے، سوانح و سیر سے ہو یا علمی وادبی مضامین سے ، حتیٰ کہ افسانہ و ناول کو بھی اس اصطلاح کے دائرے میں بلا تکلف شامل کیا جاتا رہا ہے۔ وضاحت کے لیے "داستان تاریخ اردو" مؤلفہ حامد حسن قادری سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"انگریزی زبان کا اردو پر بے حد اثر پڑا ------ اردو تحریروں میں پیراگراف قائم ہونے لگے ۔ اردو زبان میں بچوں کے قاعدے اور ریڈریں انگریزی اصول پر لکھی گئیں ۔ مغربی علوم و فنون کے اردو میں ترجمے ہوتے ۔ نئی نئی اصطلاحیں بنائی گئیں ۔ اخبارات و رسائل جاری ہوتے ۔ مقالاتِ علمی و ادبی ، مختصر فسانے ناول ، ڈرامہ ، تنقید ، سیرت ، تذکرہ ، تاریخ وغیرہ ہر قسم کی انشاپردازی انگریزی کے اصول پر اردو میں شروع ہو گئی" ۲ے

مولوی سید امیر حسین نے اپنی کتاب "اردو انشاپردازی (فن انشاپردازی کے مختصر و جامع اصول و قواعد)" میں اگرچہ انشاپردازی کو مضمون نگاری کے معنی میں استعمال کیا ہے اور انشاپردازی کی حسب ذیل تعریف کی ہے ۔

"انشاپردازی یا مضمون نگاری علم و ادب کا ایک غیر معمولی جز اور خاص فن ہے ۔ اسی فن کے ذریعے سے انسان اپنی علمی و ادبی ، تمدنی و معاشرتی ، مذہبی و تاریخی اور ہر قسم کی معلومات کو دوسروں تک پہنچا سکتا ہے اگر انسان کو لکھنے کا اچھا سلیقہ ہو تو وہ اپنے خیالات کو ایسے مؤثر انداز میں پیش کر سکتا ہے کہ جس سے پڑھنے والوں کے دل متاثر ہو جائیں اور یہی لکھنے والے کی کامیابی کا ثبوت ہے" [۱]

لیکن اس تعریف کے بعد انھوں نے "انشاپردازی کی اصناف" کا عنوان قائم کر کے تقریباً ہر قسم کی نثری تحریروں کو اس میں شامل کر لیا ہے ۔ لکھتے ہیں ۔

"اردو انشاپردازی کا دامن مختلف و گوناگوں اقسام سے بھرا ہوا ہے ۔ بعض اصناف ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہیں اور بعض ابھی تشنہ ہیں ۔ کچھ ایسی ہیں جن کی طرف اب تک زیادہ توجہ نہیں دی گئی ۔ چند اصناف حسب ذیل ہیں ۔

(۱) خالص علمی و ادبی اور تنقیدی مضامین (۲) تاریخی اور فنی مضامین (۳) افسانہ نگاری (۴) ناول نگاری (۵) ظرافت اور طنز نگاری ۔
(۶) تمثیل نگاری" [۲]

---

[۱] اردو انشاپردازی ۔ مولوی سید امیر حسین ۔ نول کشور بکڈپو ۔ لکھنؤ بار دوم ۱۹۵۶ ص ۵

[۲] ایضاً ص ۳۹

یہی نہیں بلکہ انشاپردازی کو نثری ادب کی تمام اصناف پر محیط کرنے کے بعد خطوط نویسی اور خلاصہ نویسی کے طریقے بھی بیان کئے ہیں اور ان کو انشاپردازی کا خاص جز قرار دیا ہے۔

"خطوط نویسی یا خط و کتابت بھی انشاپردازی کی ایک شاخ ہے۔" [1]

"خلاصہ نویسی یا تلخیص انشاپردازی کا ایک خاص جز ہے۔" [2]

مولف گلدستۂ پنج نے مرزا محمد مرتضیٰ عاشق، مرزا چھو بیگ ستم ظریف کے بارے میں حسرت موہانی کی درج ذیل رائے نقل کی ہے۔

"تذکرۂ شعرا کے مانند جب کبھی اردو زبان کے نثر نگاروں کے حالات بھی مرتب کیے جائیں گے اس وقت حضرت عاشق کا نام یقیناً طبقۂ اوّل کے انشاپردازوں کی فہرست میں ممتاز نظر آئے گا۔" [3]

مندرجہ بالا اقتباسات اس حقیقت کے غماز ہیں کہ انشاپردازی کی اصطلاح مطلق نثر نگاری کے معنوں میں بھی مستعمل رہی ہے کیونکہ اردو نثر کے ابتدائی دور میں ہر قسم کے موضوعات و خیالات کا اظہار ایک مخصوص اسلوب نگارش میں کیا جاتا تھا جس میں قافیہ، صنائع لفظی و معنوی اور تشبیہ و استعارہ کی بھرمار ہوتی تھی۔ عبارت آرائی کی خاطر ذرا سی بات کو بے جا طول دیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں فارسی کی نثرِ مصنوع یا نثرِ فنی کی تقلید میں اسی قسم کے طرزِ نگارش کا دور دورہ تھا اور اسی قسم کی نثر ہی ادبی سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اردو کے ابتدائی نثری ادب یعنی انشاپردازی

---

[1] اردو انشاپردازی۔ مولوی سید امیر حسن۔ نول کشور بکڈپو۔ لکھنؤ۔ بار دوم ۱۹۵۶ء ص ۴۵

[2] ایضاً ص ۵۴

[3] گلدستۂ پنج مولفہ پنڈت کشن پرشاد کول۔ ہندوستانی پریس۔ نظیر آباد لکھنؤ اوّل ۱۹۱۵ء ص ۶۹

Scanned by CamScanner

پر عربی اور فارسی کے اثرات مسلّم ہیں کیونکہ اردو زبان نے فارسی زبان کی آغوش میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی اور فارسی زبان وادب کی ترویج عربی زبان وادب کے زیر اثر ہوئی۔ سومناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے ابتدائی نثری سرمائے کا ذکر کرنے سے پہلے عربی اور فارسی کے ان انشاپردازوں (نثر نگاروں) کا مختصراً ذکر کردیا جائے جن کے اثرات اردو کے اولین انشاپردازوں کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔

عربی ادب کے انشاپردازوں میں پہلا قابل ذکر نام عبدالحمید بن یحییٰ کا ہے۔

"عبدالحمید سے قبل انشاپردازی محض سادہ طریقہ پر لکھی ہوئی بات تھی جس کا کوئی قاعدہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ نہ اس نے فنی شکل اختیار کی تھی -------- اس نے مخاطب کے حسب حال خطاب میں رعایتیں کیں۔ حالات کے مطابق مضمون میں طول واختصار کو مدنظر رکھا اور مضمون کے ابتدا وانتہا میں موضوع کی مناسبت سے نیرنگی پیدا کی۔ رسائل کے شروع میں حمد وثنا کو طول دیا۔ مقبولیت کی بنا پر تمام رسائل نگاروں نے اس کے اسلوب کی پیروی کی جس سے انشاپردازی ایک مرتب ومنظم اور باقاعدہ و بااصول فن بن گیا"۔ [۱]

عبدالحمید کے بعد جن عربی انشاپردازوں کو شہرت عام اور بقائے دوام نصیب ہوئی ان میں ابن المقفع، الجاحظ، ابن العمید، صاحب بن عباد، خوارزمی، بدیع الزماں ہمدانی اور حریری کے نام سرفہرست ہیں۔ ابن المقفع ایک کامیاب مترجم تھا۔ اس نے پہلوی اور سنسکرت کی متعدد کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ اس کی ترجمہ کی ہوئی کتاب "کلیلہ ودمنہ" آج بھی عربی ادب عالیہ میں شمار ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی شہرت کا دارومدار "کلیلہ ودمنہ" پر ہی ہے۔ یہ

کتاب مجموعی طور پر سلیس نگاری کا نمونہ ہے اور اس میں قافیہ کا وہ اہتمام نہیں جو بعد کے مصنفین کی تحریروں کا امتیازی وصف ہے۔ عربی ادب میں ابن المقفع کے بعد الجاحظ کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ خوش طبعی اور مزاح کی چاشنی نے الجاحظ کی تحریروں کو زیادہ جاذبِ نظر اور دل فریب بنا دیا ہے۔ پھر بات سے بات نکالتے چلے جانے میں بھی اسے خاص ملکہ حاصل تھا۔ الجاحظ کو اپنے زمانے کے نثر نگاروں کا امام کہا جاتا ہے۔

الجاحظ کے بعد عربی انشا پردازوں میں ابن العمید نے خاص نام پیدا کیا۔ ابن العمید چونکہ شاعر تھا اس لیے اس کے اسلوب میں شعریت کا عنصر نمایاں ہے۔ تاہم اہم بات یہ ہے کہ نازک خیالی اور صنائع بدائع کے استعمال کے باوجود اس کی تحریر پیچیدہ اور ادق نہیں بلکہ اس میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ ابن العمید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انشا پردازی کے تمام گروں سے واقف تھا۔ اور خطوط نویسی کی تمام قسموں میں سبقت لے گیا تھا اس کے متعلق یہ مقولہ مشہور ہے کہ

"انشا پردازی عبدالحمید سے شروع ہوئی اور ابن العمید پر ختم ہو گئی"

صاحب بن عباد نے ابن العمید کے طرزِ نگارش کی پیروی کی اور لفظی آرائش و زینت بالخصوص سجع و تجنیس میں ابن العمید سے بھی بڑھ گیا تھا۔ رسائل صاحب بن عباد کے دیباچہ نگار کی رائے یہ ہے کہ سجع، تشبیہات، استعلات، جناسات، اقتباسات اور دیگر مزینات و محسنات کی رو سے دیکھیں تو صاحب نے اپنے مکاتیب کو وہ اسلوب دے دیا تھا کہ ایک آدھ صفت کے سوا ادوارِ مابعد میں اس صنف میں کسی قابلِ لحاظ وصف کا اضافہ نہ کیا جا سکا[1]

بدیع الزمان ہمدانی بھی عربی نثر نگاروں میں ممتاز مقام کا مالک ہے۔ اس نے
نہ صرف نثر میں ایک نئی طرز "مقامہ" ایجاد کی بلکہ عربی نثر میں تکلف و تصنع کو بھی بہت
ترقی دی۔ مرزا محمد منور لکھتے ہیں۔

"عربی میں نمایاں طور پر فنی عبارات کا آغاز بدیع الزماں ہمدانی نے اپنے مقامات
میں کیا۔ لیکن وہ عربی میں مقامات کا موجد نہ تھا اس لیے کہ اس سے پہلے
ابن درید مقامات لکھ چکا تھا۔ ہمدانی نے تکلف و تصنع کو بہت ترقی دی
اس کی نثر تمام کی تمام از قسمے منثور شاعری ہے"[1]

"عربی میں نثر مصنوع یا بالفاظِ دیگر فنی نثر کو حریری نے تکلف کے نقطۂ آخریں
تک پہنچا دیا۔ اس کے مقامات کو وہ شہرت حاصل ہوئی کہ عربی لغت
پر قادر ہونے کی خاطر لوگ انھیں سبقاً پڑھتے اور حفظ کرتے تھے۔ اس
دور میں ایران کی بھی علمی زبان عربی ہی تھی لہٰذا وہاں کے اہلِ قلم پر حریری نے
بڑا گہرا اثر چھوڑا"[2]

عربی نثر کے زیر اثر فارسی نثر میں بھی تکلف و تصنع اور عبارت آرائی کو اہمیت ملنے
لگی۔ ابو المعالی نصر اللہ بن محمد کی معروف کتاب "کلیلہ و دمنہ" اور سعد الدین وراوینی
کے "مرزبان نامہ" فارسی نثر کی اولین پر تکلف کتابیں ہیں۔ فارسی نثر میں تکلف اور
تصنع کے سلسلے میں سب سے اہم نام قاضی حمید الدین کا ہے۔ جس نے مقاماتِ ہمدانی
اور مقاماتِ حریری سے متاثر ہو کر "مقاماتِ حمیدی" تحریر کی۔ چونکہ مقاماتِ ہمدانی
اور مقاماتِ حریری کا اسلوبِ نگارش بے حد پر تکلف اور مصنوعی ہے۔ اس لیے

---

[1] انشاد مکتوبات ۔ مرزا محمد منور ۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند
اوّل ۱۹۷۱ء تیسری جلد ص ۳۶۱

[2] ایضاً ص ۳۶۲

حمید الدین نے بھی اسی اسلوب کو اپنایا۔ گویا عربی مقامات کے جواب میں فارسی مقامات تحریر کیے اور اس میں شک نہیں کہ مقاماتِ حمیدی کو مقاماتِ ہمدانی اور مقاماتِ حریری کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے مگر محمد حسین آزاد مقاماتِ حمیدی کی پر تکلف نثر سے کچھ زیادہ خوش معلوم نہیں ہوتے۔ لکھتے ہیں۔

”بعض اشخاص کو شوق پیدا ہوا کہ عرب کی انشا پردازیوں کے انداز سے فارسی میں ایجادیں دکھائیں۔ چنانچہ ۵۵۰ھ میں قاضی حمید ابوبکر نے مقامات حریری پر مقاماتِ حمیدی لکھی۔ اس میں عربی عبارتیں بھی ویسی ہی مقفّیٰ ہیں۔ اور فارسی زمزموں کو عرب کے الحان میں ادا کیا ہے عبارت کو دیکھو تو لفظی ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ متواتر مترادف الفاظ، مشکل لغات، اس پر اضافتوں کے الٹ پھیر محاورہ مفقود ہو گیا۔ زبان کو فارسیہ سے واسطہ نہیں رہا۔ عربی لفظوں کی یہ بہتات ہے گویا ریگستانِ عرب سے آندھی اٹھی“ ؎۱

مولانا آزاد نے مقاماتِ حمیدی کی زبان پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ یقیناً وزنی اور درست ہیں مگر چونکہ اس زمانے میں ایران کی علمی اور ادبی زبان عربی تھی اس لیے فارسی عبارتوں میں عربی الفاظ و محاورات اور امثال کا استعمال عام تھا۔ پھر چونکہ مقاماتِ حمیدی مقاماتِ حریری کے جواب میں لکھے گئے اس لیے بھی عربی محاورات و الفاظ کا استعمال ناگزیر تھا۔ بہر حال فارسی پر تکلف نثر چنگیزی دور تک اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ اس دور میں تاریخ کی جو کتب لکھی گئیں ان میں بھی یہی پر تکلف اور مصنوعی انداز اختیار گیا ہے۔ عبداللہ وصاف کی ”تاریخ وصاف“ ایک ایسی ہی کتاب ہے جس میں تشبیہہ، استعارہ اور قافیہ کی وہ بہتات ہے کہ مطلب گم ہو کر رہ گیا ہے جو مطلب ایک

؎۱ سخندانِ فارس۔ محمد حسین آزاد صـ ۲۱۷

Scanned by CamScanner

فقرے سے ادا ہو سکتا تھا اسے کئی کئی فقروں میں ادا کیا گیا ہے۔ تعریف و توصیف میں وہ مبالغہ کیا گیا ہے کہ باید و شاید۔

اہلِ ایران کے ان تکلفات نے برصغیر کے فارسی دانوں کو بھی تکلف و تصنع کی طرف مائل کیا۔ ہندوستان میں غالباً امیر خسرو کی تصنیف "اعجازِ خسروی" اس رنگ کی پہلی کتاب ہے جس میں ایہام، رعایتِ لفظی، طباق و تضاد اور دیگر صنعتیں بکثرت استعمال کی گئی ہیں حالانکہ اس میں نثر نویسی کے اسالیب اور محاسن وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

"انشائے ماہرو" بھی اسی دور کی تصنیف اور اسی رنگ کا نمونہ ہے۔ نثر میں جس قدر بھی صنائع بدائع استعمال ہو سکتے ہیں وہ سب اس میں استعمال کئے گئے ہیں۔ چنانچہ ماہرو کو ہندوستان کے صفِ اوّل کے انشاپردازوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

امیر خسرو اور ماہرو کے بعد ہندوستان میں جس شخص کو انشاپردازی کا امام مانا گیا اس کا نام محمود گاواں ہے۔ "مناظر الانشا" اور "ریاض الانشا" اس کی دو کتابیں ہیں۔ "مناظر الانشا" میں فنِ انشا سے بحث کی گئی ہے اور "ریاض الانشا" اس کے خطوط کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھے گئے۔

امیر خسرو اور ماہرو کا تعلق عہد خلجی و تغلق سے ہے اور محمود گاواں سید و لودھی خاندان کے عہدِ حکومت کا انشاپرداز ہے۔ مغلیہ دور میں جن انشاپردازوں کو شہرت نصیب ہوئی ان میں ظہوری ترشیزی اور ابوالفضل کے نام نمایاں ہیں۔ ملک الشعرا ملا نورالدین محمد ظہوری کی "سہ نثر ظہوری" جو تین دیباچوں پر مشتمل ہے اوّل سے آخر تک ضلع جگت کا نمونہ ہے۔ ان کی عبارت انتہائی مشکل اور پیچیدہ ہے۔ صنائع لفظی اور معنوی کی بدولت "سہ نثر ظہوری" کو خاص شہرت حاصل ہوئی اور سبھی انشاپردازوں نے اس اسلوبِ نگارش کو اپنانے کی کوشش کی۔

اس دور کے جس دوسرے انشاپرداز نے اہلِ قلم کو متاثر کیا اس کا نام ابوالفضل

ہے۔ ابوالفضل نے بھی تشبیہ واستعارہ، قافیہ اور رعایتِ لفظی ومعنوی سے اپنی نثر کو زوردار بنایا ہے۔ تفصیل وتکرار کے باوجود اس کا ذخیرۂ الفاظ ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس کے ہم معنی فقروں کو دیکھ کر اس کے ذہنِ رسا کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ ایک بات کو کتنے کتنے پیرایوں میں بیان کرنے کا ڈھنگ اسے خوب آتا تھا۔ اپنی انہی خوبیوں کی وجہ سے وہ اپنے دور کے لکھنے والوں کے لیے قابلِ تقلید ٹھہرا۔

چونکہ مغلیہ دور میں ہندوستان کی علمی، ادبی اور سرکاری زبان فارسی تھی۔ اس لیے جب اردو زبان کو ادبیات کے لیے وسیلۂ اظہار بنایا گیا تو لاشعوری طور پر فارسی کے معیاروں کو ہی مدِنظر رکھا گیا اور اردو نظم ونثر میں بھی وہی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جو فارسی سے مخصوص تھیں۔ اس مقصد کے لیے وہی حربے استعمال کیے جانے لگے جو فارسی انشاپردازوں کی شہرت کا باعث بنتے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا ابتدائی نثری سرمایہ فارسی کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔ اردو کی نثری داستان "نوطرزِ مرصع" کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"غرض کہ بادشاہ درمیان کنج اس مکان کے اس طور سے کہ کسی پر اطلاع نہ ہو پوشیدہ وپنہاں جا بیٹھا اور صدفِ گوشِ ہوش تئیں کے واسطے پُر کرنے مروارید کلماتِ ممنیت آیات درویشوں کے وا کیا۔ اتنے میں درمیان ان چہار درویش کے ایک شخص نے عندلیبِ زبان کے تیئں بیچ گلزار سخن آرائی کے نغمہ پرداز کیا کہ اے یارانِ ہمراز و اے رفیقانِ دمساز، ہم چار شخص انقلابِ روزگارِ غدار وگردشِ دورِ دوار کے سے حیران وپریشان وارد اس مکان کے ہوتے تھے لیکن الحمدللہ والمنۃ کہ رہبریٔ قسمت ویاوریٔ بخت ہمارے کی سے شامِ تنہائی نے ساتھ فروغِ شمعِ ملاقات ہمدیگر کے روشنی پائی مگر بالفعل کی درازی سررشتۂ شبِ تار کی زنجیرِ بے خوابی کی بیچ پاتے

استراحت کے ڈالی ہے۔ اس سے صلاحِ وقت یہ ہے کہ واسطے شغل
بیداری کے ہر ایک قفلِ گنجینۂ زبان کے تئیں ساتھ کلید تشریح و تفصیل
قصہ سرگزشت واقعی اپنے کے کھولے کہ اس وسیلہ سے متاعِ فوائدِ محبت
سراپا برکت یک دیگر کے بیچ کیسۂ تمنا کے حاصل کریں۔ یارانِ دیگر نے انگشت
قبولیت کی اوپر رضا و رغبت کے رکھ کے کہا کہ کیا مضائقہ اوّل آپ ہی
صورتِ حال اپنی کے جو کچھ بہ چشمِ یقین کے دیدۂ حقائق بیں کے دیکھا
ہو اوپر صفحۂ اظہار کے کھینچ کے گوشِ رفیقانِ ہمدم کے تئیں گرانبار
گوہرِ منت کا کریں،،[1]

نوطرزِ مرصع کی یہ عبارت فارسی کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتی
ہے اسے محض تکلفاً ہی اردو کہا جا سکتا ہے اردو کو فارسی کا ہم پلہ و ہم رتبہ بنانے کی خواہش
نے ہی عبارت آرائی، قافیہ پیمائی، تشبیہہ و استعارہ اور دیگر صنائع لفظی و معنوی یعنی تجنیس
ایہام، رعایت لفظی اور مبالغہ آرائی کو اردو نثر کا لازمی حصہ بنایا۔ اگر صنائع بدائع کو ہی سب
کچھ سمجھ لیا جاتے تو عبارت چیستاں اور معما بن جاتی ہے۔ فارسی کی تقلید سے یہ فائدہ تو ضرور
ہوا کہ فارسی نثر صدیوں کی ترقی کے بعد جس مقام پر پہنچی تھی۔ اردو نثر ایک ہی جست میں
اس مقام کو چھوتی ہوتی نظر آتی لیکن اس سے اردو نثر کے فطری ارتقاء کو نقصان بھی پہنچا
کیونکہ وہ ساری خامیاں جو فارسی نثر میں تھیں اردو نثر میں بھی در آئیں۔ عبارت آرائی،
مبالغہ آرائی، اور رعایتِ لفظی کا غیر ضروری استعمال خامیوں ہی کے ذیل میں آتا ہے۔ اگر
اردو کے انشاپرداز فارسی نثر کو معیار قرار نہ دیتے تو اردو نثر فورٹ ولیم کالج کے قیام سے

---

[1] نوطرزِ مرصع۔ میر عطا حسین تحسینؔ مرتبہ سید نور الحسن ہاشمی۔ ہندوستانی اکیڈمی
الہ آباد۔ اوّل ۱۹۵۸ء ص ۶۶-۶۵

کہیں پہلے اپنی انفرادی حیثیت تسلیم کروا چکی ہوتی کیونکہ مرصّع اسلوب کی کارفرمائی عموماً ادبی تصانیف ہی میں نظر آتی ہے اس دور کی مذہبی کتب عموماً سادہ نویسی کی مثال پیش کرتی ہیں کیونکہ ان کتابوں کا مقصد ادب اور ادبیت نہیں بلکہ تعلیم و تبلیغ تھا اور تعلیم و تبلیغ کے لیے بول چال کی زبان ہی کارآمد تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد بھی چونکہ انگریزوں کو ہندوستانی زبان سے واقف کرانا تھا اس لیے انھوں نے بھی بول چال کی زبان کو اہمیت دی اور روزمرہ محاورہ میں اردو کتب تالیف و ترجمہ کرانے کا کام شروع کیا۔ یہی وجہ ہے سادہ نویسی کی ترویج کے سلسلے میں ذہن فورٹ ولیم کالج کی طرف منتقل ہوتا ہے ورنہ اردو نثر میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل بھی مرصّع اسلوب کے ساتھ ساتھ سادہ اور عام فہم اسلوب موجود تھا۔ البتہ یہ سادہ اسلوب عموماً مذہبی کتب تک محدود تھا۔ ادبی کتب کو سادہ اسلوب کے لیے درخور اعتنا نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے رجب علی بیگ سرور نے میر امن کی "باغ و بہار" کے جواب میں فسانۂ عجائب تخلیق کی جو مرصّع اسلوب کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ گویا فورٹ ولیم کالج نے سادہ نویسی کی جو تحریک شروع کی تھی اسے کالج سے باہر زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی اور ادبی کتب بدستور مرصّع و مقفیٰ اسلوب میں تخلیق کی جاتی رہیں۔ یہی نہیں بلکہ حکایات، تقریظات، تواریخ اور خطوط میں بھی اس اسلوب کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وضاحت کے لیے چند ایک اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

داستان سننے سنانے کی چیز ہے اور اس حیثیت سے داستان کو روزمرہ بول چال کے قریب ہونا چاہیے لیکن اردو کو فارسی کے رتبہ تک پہنچانے اور انشاپردازی کا زور دکھانے کے لیے داستان نگاروں نے اس بنیادی نکتہ کی طرف مطلق توجہ نہیں کی اور داستانوں میں بھی مرصّع اسلوب سے کام لیا گیا ہے۔ رجب علی بیگ سرور کی داستان "فسانۂ عجائب" کے یہ اقتباسات دیکھیے۔

ریگِ صحرا کیفیتِ دریا دکھاتی تھی۔ پیاسوں کی دوڑ دھوپ میں جان جاتی تھی۔ زاغ و زغن سے سناٹا، دھوپ کا تڑاقا، دشت کا پتھر تپنے سے انگارا تھا۔ جانور ہر ایک پیاس کا مارا تھا۔ وہ تابشِ شمس جس سے ہرن کالا ہو۔ مذکور سے زبان میں چھالا ہو، بادِ سموم سے وحشیوں کے منہ پر سیہ تاب تھا۔ لوں سے گاوِ زمین کا جگر کباب تھا۔ مچھلیاں پانی میں بھنتی تھیں۔ جل جل کر کنارے پر سر دھنتی تھیں۔ سرطانِ فلک جلتا تھا۔ کیکڑا اب دریا اُبلتا تھا"[1]

"وہاں کے باغ کا کیا کہنا۔ اگر ایک تختہ کی صفت تحریر کروں ہزار تختہ کاغذ پر بخط ریحاں نہ لکھ سکوں، دمِ تسطیر قلم میں برگ نکلتے ہیں۔ لکھنا بار ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں بالکل پھولتے ہیں۔ صفحۂ قرطاس پر گل پھولتے ہیں۔ حاسد کو خار ہوتا ہے"[2]

"موسم کی تاک میں تاک کا مستوں کی روش جھومنا، غنچۂ سربستہ کا منہ تاک تاک کر نسیم کا چومنا"[3]

پہلے اقتباس میں مبالغہ آرائی اور قافیہ پیمائی پہلی ہی نظر میں محسوس ہو جاتی ہے۔ دوسرے اقتباس میں رعایتِ لفظی اور تیسرے میں تجنیس نمایاں ہے اور یہ اسلوب صرف داستان تک ہی محدود نہ تھا بلکہ تاریخ ایسے ٹھوس موضوعات کا بیان بھی اسی پیرایۂ اظہار میں کیا جاتا رہا ہے۔ رجب علی بیگ سرور ہی کی کتاب سرورِ سلطانی (ترجمہ شمشیر خانی) سے قافیہ پیمائی اور رعایتِ لفظی کی مثال دیکھیے۔

"ملک الموت کی گرم بازاری ہوتی۔ دمِ نقدِ جان کی خریداری ہوتی۔ پیر و جوان کا

---

[1] فسانۂ عجائب مرتبہ عبدالروف عروج۔ سلطان حسین اینڈ سنز کراچی اوّل ۱۹۶۳ء ص ۵۵

[2] فسانۂ عجائب۔ رجب علی بیگ سرور ص ۵

[3] ایضاً

دمِ شمشیرِ براں، زبانِ خنجر، نوکِ سناں نے ایک بھاڑ لگایا۔ بیعانے میں سر و تن کی جدائی۔ دلالی میں زخموں کا ہار ملا۔ چوک جمانے کو دشتِ کارزار ملا۔ کیفیتِ فصلِ بہار نظر آئی۔ خون کا جوش ہوا۔ فلکِ اخضر چادرِ شفق اوڑھ کر سرخ پوش ہوا۔ قضائے کار دارا قریبِ شامِ غم انجام دشتِ نبرد سے آلودہ گرد سے خیمہ گاہ کو پھرا۔"[1]

حکایات و قصص میں بھی قافیہ پیمائی اور رعایتِ لفظی کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ محمد بخش مہجور کی کتاب "انشائے نورتن" رعایتِ لفظی کا شہکار کہی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کی کوئی حکایت ایسی نہیں ہے جس میں رعایتِ لفظی سے کام نہ لیا گیا ہو۔ تاہم اس اہتمام کے باوجود "نورتن" کی عبارت میں پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی بلکہ خوشگوار تاثر چھوڑتی ہے۔ ایک مختصر ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"غرض وہ نازنیں ماہ جبیں بادلِ اندوہ گیں ادھر اس نویسندہ کے روبرو ایک پردے کی اوٹ میں بیٹھی یہ حال پُرملال کہہ رہی تھی اور ادھر عشق کا فراش پردے پردے میں اس نویسندہ آفت رسیدہ کا پردہ چاک کرنے کے درپے ہوا۔ اور حاکمِ عشق کا افواجِ غم کو یہ شقہ پہنچا کہ صبر و شکیبائی کا خیمہ اس کے ملکِ دل سے باہر نکالو اور درد و محن کا اسپک وسعتِ سینہ پر چوبِ آہ سے استادہ کر دو اور نگیرۂ چشم کے آگے حیرت کی قنات روک کر بے خودی کے سراپچے کھینچ کر اس ہرزہ گرد پر درد کو وحشت کے سلامت کوچے میں چھوڑ دو۔"[2]

خطوط و رقعات ذاتی نوعیت کے سبب عموماً بے تکلفی سے لکھے جاتے ہیں

کہا جاتا ہے کہ خطوط شخصیت کی صحیح عکاسی کرتے ہیں کیونکہ خط لکھتے وقت مکتوب نگار کے پیش نظر قارئین کے بجائے صرف وہ دوست یا رشتہ دار ہوتا ہے جس کے نام وہ مکتوب لکھ رہا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بغیر کسی رکھ رکھاؤ اور شعوری کاوش کے اپنا مدعا صاف صاف لفظوں میں کاغذ پر منتقل کر دیتا ہے۔ مگر اس خاص دور کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں خطوط بھی رسمی انداز سے لکھے جاتے تھے اور لکھنے والے کی تمام کوشش عبارت آرائی، قافیہ پیمائی اور تکلف و تصنع میں صرف ہوتی تھی۔ رجب علی بیگ سرور اپنے ایک ممدوح کے رقعہ کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"شقہ کو کھولا، تہی دستی کے باعث نقدِ جاں سے تولا، ہر فقرہ رنگین غازۂ شاہدِ معنی تھا۔ خدا گواہ ہے۔ مطلب متین آئینۂ جمالِ خوش بیانی تھا۔ واہ واہ ہے۔ بحرِ ناپیدا کنار کوزے میں بند ہے کس طول کا اختصار کیا ہے۔ جبذا منشی دل پسند ہے کار کیا ہے اگر ملا ظہوری کا ظہور ہوتا بزنگِ طفلِ دبستاں معترف بقصور ہوتا۔ تحریر منشیانہ، تقریر مدبرانہ کس قدر مطلب خیز ہے۔ نامۂ نامی شقۂ گرامی توقیر کی دست آویز ہے۔ فیضی زندہ ہوتا تو فیض پاتا ابوالفضل باین فضل و کمال آنکھوں سے لگاتا۔ قتیل کے ڈھنگ کا گو زمانہ زخمی ہے وہ بھی اس نہرِ فصاحت و بلاغت سے اپنے لبِ تشنہ سیراب کرتا۔ طاہر وحید بھی یکتا سمجھ کر سلاست کا دم بھرتا۔" [1]

مولانا غلام غوث بے خبر کے ایک خط کا اقتباس دیکھیے۔

"محبت نامہ پہنچنے نے ساری شکایتوں کو دل سے دھو ڈالا۔ کیونکہ ایسا نہ ہوتا میں طفیلی سلام کا مشتاق تھا۔ آپ نے براستہ مجھی کو خط لکھا۔ جو ایک پھول ڈھونڈتا ہو وہ چمن میں پہنچے، جس کی آنکھیں پیرہن کے انتظار میں سفید ہوتی

---

[1] انشائے سرور مرتبہ میرزا احمد علی۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ۔ اشاعت پنجم ۱۹۱۶ء، ص ۸

ہوں وہ یوسف کو دیکھے ، ذرہ کے طالب کو خورشید جلوہ دکھلتے ، قطرہ کے
آرزومند کے سامنے دریا لہراتے ۔ بلور کے متلاشی کو الماس ملے ، روپے کے محتاج
کے واسطے خزانے کا دروازہ کھلے ، طبیب کو بلائیں اور مسیحا آتے ۔ دوا منگائیں
اور شفا مل جاتے ۔ صدف کا متمنی صاحبِ دُرِ شہوار ہو ۔ بوریئے کا حاجت مند
مالکِ تختِ زرنگار ہو .... الخ ،، ؎[1]

مختلف اصنافِ نثر کے یہ اقتباسات اس حقیقت کے غماز ہیں کہ انشا پردازی کی
اصطلاح ادب کی کسی صنف کے لیے نہیں بلکہ اسلوب کے لیے استعمال ہوتی رہی ہے
اسلوب یا اسٹائل الفاظ کے مخصوص استعمال سے پیدا ہوتا ہے ۔ تخلیق کار جب ایک خاص
انداز اور سلیقے سے الفاظ استعمال کرتا ہے تو اس سے اس کا انفرادی اسلوب جنم لیتا ہے
جو اسے دوسرے لکھنے والوں سے الگ کرتا ہے ۔ ہر تخلیق کار کا ایک خاص لہجہ اور انداز
گفتگو ہوتا ہے ۔ جس کا عکس غیر شعوری طور پر اس کی تحریر میں منعکس ہوتا ہے ۔ گویا اسلوب
لکھنے والے کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز بھی
اسلوب پر اثر انداز ہوتی ہے اور وہ ہے اپنے دور کا مخصوص رجحان جو ماضی اور حال کے
ادبی سرمائے سے وجود میں آتا ہے ۔ اسے اجتماعی اسلوب کہہ لیجیے جو ایک مخصوص دور
کی تمام تحریروں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے ۔ گزشتہ صفحات میں منقول تمام اقتباسات
میں تفصیل و اطناب کا رجحان نظر آتا ہے ۔ چھوٹی سی بات کو گھما پھرا کر ، تکرار کی زنجیر میں
پرو کر طول دینے کی کاوش ان اقتباسات میں نمایاں ہے ۔ سادہ اور بے تکلف
اندازِ بیان کی بجاتے منشیانہ عبارت آرائی اور لفاظی ان تحریروں میں قدر مشترک کی
کی حیثیت رکھتی ہے ۔ منظر کشی ، جزئیات نگاری ، تشبیہہ و استعارہ رعایت لفظی

؎[1] انشائے بے خبر ۔ مولوی غلام غوث بے خبر ۔ ادبی دنیا ۔ علیگڑھ اوّل ۱۹۶۰ء صـ ۲۵

اور دیگر صنائع بدائع کا استعمال ان تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اصل میں ظاہری آرائش و زیبائش اس زمانے کے ماحول کا ایک حصہ تھا۔ تکلف و تصنع کا اظہار صرف انشاپردازی تک محدود نہ تھا بلکہ اس کا اظہار اس دور کے لوگوں کے لباس، آدابِ گفتگو اور دیگر رسومات میں بھی ہوتا ہے۔ میناکاری کا رجحان صرف انشاپردازی ہی سے مخصوص نہیں بلکہ اس دور کی عمارات خصوصاً مساجد اور مندر بھی اسی رجحان کے آئینہ دار ہیں۔ ضلع جگت اور فقرہ بازی اس دور کے من چلے لوگوں کا خاص مشغلہ تھا۔ سو انشاپردازی نے بھی اس روایت کو اپنایا۔ جھوٹی آن بان اور مبالغہ آرائی پر اس دور کے امراء جان دیتے تھے۔ چنانچہ غیر شعوری طور پر انشاپردازی میں بھی یہ اوصاف نمایاں ہوتے چلے گئے۔ کیونکہ اسلوبِ نگارش صرف انفرادی شخصیت ہی کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ اجتماعی شخصیت یا ماحول کے نمایاں اوصاف بھی اجاگر کرتا ہے۔ ادیب کی شخصیت پر ماحول کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ وہ ادب میں اپنے ذاتی میلانات و رجحانات ہی کو پیش نہیں کرتا بلکہ اجتماعی رجحانات کی عکاسی بھی کرتا ہے۔

گویا انشاپردازی صنف ادب نہیں بلکہ ایک مخصوص اسلوبِ نگارش ہے جس کے نمایاں اوصاف قافیہ، تشبیہہ و استعارہ، توریہ و تجنیس، رعایتِ لفظی اور دیگر صنائع و بدائع وغیرہ کا استعمال ہے۔ یہ اصطلاح کسی ایک صنف تک محدود نہیں بلکہ اردو ادب کے ابتدائی دور کی تقریباً تمام نثری اصناف پر محیط ہے کیونکہ یہ اس زمانے کا عام رواج تھا۔ سید نورالحسن ہاشمی "نوطرز مرصع" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"بعض قدیم تذکروں اور "نوطرز مرصع" کے پرانے نسخوں میں کتاب کا نام "انشا نوطرز مرصع" ملتا ہے لیکن بعد کے نسخوں میں "نوطرز مرصع" باقی رہ گیا۔ بات یہ ہے کہ پرانے زمانے میں انشا کا لفظ ہر اس نثر کے ساتھ استعمال کیا جاتا تھا جس میں اسلوب بیان کی کچھ ندرت ہوتی تھی۔ بعد میں کاتبوں

نے سہو سے یا عمداً ناشرین نے یہ لفظ اڑا دیا ۔ "نوطرز مرصع" جس زمانے میں لکھی گئی تھی یعنی اٹھارویں صدی عیسوی میں اس وقت زبان و بیان کا معیار فارسی انشاپردازی کے تتبع میں یہی تھا کہ عبارت میں تکلف و تصنع بہت ہو۔ سیدھی سی بات بھی تشبیہہ و استعارے کے پردے میں کہی جاتی تھی اور صنائع لفظی و معنوی کا التزام خاص طور سے کیا جاتا تھا۔ کسی کے معائب یا محاسن بیان کرنا ہوتے تو وہاں بھی مبالغہ غلو کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ عبارت آرائی کی خاطر ذرا سی بات کو بے جا طول دیا جاتا تھا۔ غرضیکہ یہ تمام لوازم اس زمانے کی انشاپردازی کا معیار تھے۔ جو انشاپرداز ان خوبیوں کے ساتھ عبارت نہ لکھ سکتا انشاپرداز اور ادیب نہ سمجھا جاتا تھا۔[1]

اس کے برعکس انشائیہ کی اصطلاح ایک مخصوص صنفِ ادب کے لیے استعمال ہوتی ہے جس کا ایک خاص داخلی مزاج ہے۔ انشائیہ نگار اختصار سے کام لیتا ہے جب کہ انشاپردازی میں تفصیل و اطناب کا رجحان نمایاں ہے انشائیہ نگار عموماً غیر رسمی انداز اختیار کرتا ہے جبکہ انشاپردازی میں تکلف و تصنع، عبارت آرائی، قافیہ پیمائی اور غیر رسمی لفاظی سے کام لیا جاتا ہے اور ایک مفہوم کو کئی کئی فقروں پر پھیلا کر اک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار ذاتی تجربات و انفرادی محسوسات کے اظہار کو اولیت دیتا ہے۔ جب کہ انشاپردازی میں عموماً خارجی منظر نگاری کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انشاپردازی میں موضوعیت کے بجائے معروضیت کو اہمیت حاصل ہوتی ہے جب کہ انشائیہ میں موضوعیت کو اہمیت

---

[1] نوطرز مرصع۔ میر عطا حسین تحسین۔ مرتبہ سید نورالحسن ہاشمی۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد اول ۱۹۵۸ء ص ۲۸-۲۷

دی جاتی ہے۔ ان تفاصیل کی روشنی میں بظاہر انشاپردازی کا انشائیہ سے ربط و تعلق
نظر نہیں آتا لیکن انشائیہ کا ایک وصف حسنِ انشا یا تخلیقی تازگی ہے اور اردو کی قدیم
انشاپردازی کے تمام نمونے حسنِ انشا کا بہترین نمونہ ہیں کیونکہ قدیم زمانے میں عاری
نثر کو عموماً ادب کا درجہ نہیں دیا جاتا تھا۔ صرف وہی تحریریں ادب میں شمار ہوتی تھیں جن
میں لفظ کو تخلیقی انداز سے استعمال کیا جاتا تھا۔ جدید انشائیہ میں جو تازگی پائی جاتی ہے
اسے قدیم انشاپردازی کا نکھرا ہوا روپ کہہ سکتے ہیں۔

جہاں تک ذہن کی آزادہ روی اور بات سے بات پیدا کرنے کا تعلق ہے
اس کا رشتہ بھی قدیم انشاپردازی سے جوڑا جا سکتا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ انشائیہ
میں بات سے بات پیدا کرنے کا رجحان فکری سطح پر ہے جب کہ انشاپردازی میں
یہ رجحان تصوراتی اور تخیلاتی نوعیت کا ہے۔ یعنی انشائیہ میں ذہن ایک بات سے
دوسری بات کی طرف منتقل ہوتا ہے اور انشاپردازی میں ایک لفظ سے دوسرے
لفظ کی طرف سفر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ رعایتِ لفظی اور تشبیہ کی مدد سے نئے نئے مضامین
پیدا کرنے اور موضوع کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کا رجحان انشاپردازی میں بھی
خاصا نمایاں ہے۔ ان دونوں رویوں میں جو مماثلت ہے ان کے پیشِ نظر یہ کہا جا
سکتا ہے کہ اردو کی قدیم انشاپردازی میں بھی انشائیہ سے ملتی جلتی خصوصیات موجود ہیں

انشائیہ میں انشائیہ نگار عموماً ذاتی تاثرات و تجربات بیان کرتا ہے۔
انشاپردازی میں اگرچہ خارجی منظر نگاری اور جزئیات نگاری کی طرف زیادہ توجہ
دی جاتی تھی مگر منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے ضمن میں جن تشبیہات سے بات
کی وضاحت کی جاتی تھی وہ لکھنے والے کی افتادِ طبع کی چغلی کھاتی تھیں۔ بعض
تحریروں میں ذاتی تاثرات و تجربات بلاواسطہ بھی بیان ہوئے ہیں ایسی تحریریں
بھی ایک حد تک انشائیہ سے مماثلت رکھتی ہیں۔ انشائیہ کی ایک اور خوبی موضوع

Scanned by CamScanner

کے مخفی مفاہیم کو اجاگر کرنا ہے۔

انشا پردازی میں موضوع کو نئے زاویے سے پیش کرنے کا رویہ نئی اور اچھوتی تشبیہات کے استعمال کی صورت میں ملتا ہے لیکن اس کے باوجود قدیم انشا پردازی کو جدید انشائیہ کی کسوٹی پر پرکھنا یا اسے انشائیہ کہنا مناسب نہیں، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی قدیم انشا پردازی کے بعض نمونوں میں انشائیہ کے کچھ اوصاف منتشر حالت میں موجود ہیں کیونکہ وہ نثری تحریریں بھی جذباتی اور تخیلاتی رویوں کی پیداوار ہیں لہٰذا اردو انشائیہ کے تدریجی ارتقا میں ان کا ذکر ناگزیر ہے۔

انگریزی نثر کی سادگی اور قطعیت کے زیرِ اثر ۱۸۵۷ء کے بعد نثر میں مقفیٰ عبارت آرائی، تشبیہہ واستعارہ اور قافیہ کا استعمال ناپسند کیا جانے لگا، فورٹ ولیم کالج کی سادہ نویسی کی تحریک کے علاوہ مرزا غالب کے خطوط کی سادگی اور برجستگی نے بھی اردو نثر کو تکلف و تصنع کی گرانباری سے آزاد کرانے میں یقیناً اپنا کردار ادا کیا لیکن اس سلسلے میں سب سے نمایاں اور موثر کام سر سید احمد خاں کا ہے سر سید احمد خان اور ان کے رفقا نے خیالی موضوعات پر عبارت آرائی کے بجائے عصری مسائل ومعاملات پر سادہ اور منطقی انداز میں مضامین لکھ کر اردو نثر کے دامن کو جو وسعت عطا کی، آئندہ باب میں اس کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

Scanned by CamScanner

تیسرا باب — انشائیہ اور مضمون

مضمون کا لفظ اپنی اصل کے اعتبار سے عربی ہے جس کے لغوی معنی ہیں ضمن میں لیئے ہوتے لیکن عام طور پر اسے انگریزی ایسے کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اردو ادب میں مضمون نگاری انگریزی ادب کی صنف ایسّے کے زیر اثر شروع ہوئی جیسا کہ گزشتہ صفحات میں تفصیلاً مذکور ہو چکا۔ تاہم گزشتہ بحث خالص ایسّے (انشائیہ) سے متعلق تھی جب کہ اس باب میں ایسّے سے وہ عمومی مضامین مراد ہیں جن کا باقاعدہ آغاز سرسید احمد خاں کے مضامین سے ہوا اور جنھیں بعض لوگ مقالہ کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں مثلاً حامد حسن قادری لکھتے ہیں۔

> "سرسید کی بعض تصانیف مثلاً خطبات احمدیہ اور اکثر مضامین تہذیب الاخلاق ایسے موضوعوں پر اور اس قدر خوش اسلوبی کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ ان سے پہلے اردو کیا عربی اور فارسی میں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ سرسید کی کتابوں سے زیادہ ان کے مضامین مفید ہیں جن سے اردو میں فنِ مقالہ نگاری پیدا ہوگیا" [۱]

محولہ بالا اقتباس میں مضمون اور مقالہ کی اصطلاح ایک ہی معنی میں استعمال کی گئی ہے۔ حالانکہ مضمون اور مقالہ میں خاصا فرق ہے۔ پہلا فرق تو یہی ہے کہ مضمون عموماً مختصر ہوتا ہے جبکہ مقالہ نسبتاً طویل ہوتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ مضمون میں عموماً کسی موضوع کے چند پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے جب کہ مقالہ موضوعِ زیرِ بحث کے تمام پہلوؤں کا محاکمہ کرتا ہے۔ البتہ معروضی انداز، طرزِ استدلال اور ربط و توازن مضمون اور مقالہ دونوں اصناف میں

---

[۱] داستان تاریخ اردو۔ حامد حسن قادری ص ۳۳۸

یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ اصل میں مقالہ مضمون کی توسیعی شکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے
ہاں مقالہ اور مضمون میں کوئی خاص تخصیص نہیں کی جاتی۔ اردو میں مضمون کی جو تعریف رائج ہے
وہ مقالہ پر بھی صادق آتی ہے۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے مضمون کی تعریف یوں کی ہے۔

"کسی متعین موضوع پر اپنے خیالات اور جذبات و احساسات کا تحریری اظہار
مضمون کہلاتا ہے۔ مضمون کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ دنیا کے ہر
معاملے، مسئلے یا موضوع پر مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ مضمون کی بالعموم ایک خاص
ترتیب ہوتی ہے۔ سب سے پہلے زیر بحث مسئلے کا تعارف کرایا جاتا ہے
پھر اس کی حمایت یا مخالفت میں دلائل دیئے جاتے ہیں اور آخر میں نتیجہ پیش
کیا جاتا ہے۔ بعض مضامین تاثراتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان میں ایسی
ترتیب اور دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ ہر مضمون کے لیے نظم و ضبط
توازن اور تناسب ضروری ہے"[1]

گویا مضمون نگار مضمون میں معروضی انداز بیان اختیار کرتے ہوئے موضوع زیر بحث کو
ایک خاص فاصلے سے دیکھتا ہے وہ مضمون میں باقاعدہ مثبت و منفی دلائل کا سلسلہ قائم
کرتا اور ان دلائل کی روشنی میں نتائج کا استنباط کرتا ہے۔ غالباً یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں
کہ مضمون کی محولہ بالا تعریف کو انگریزی کے خالص ایسے یعنی انشائیہ سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ یہ
تعریف اس عمومی ایسے کی ہے جس کی سرحدیں درسی مضمون اور مقالہ نگاری سے منسلک
ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں مضمون کا یہی تصور و مفہوم ہے اسی وجہ سے
مضمون کی اصطلاح ہر قسم کے مضامین و مقالات کے لیے بے تکلف استعمال کی جاتی
ہے۔ چنانچہ علمی، ادبی، تاریخی، تنقیدی، سوانحی، فلسفیانہ اور اصلاحی موضوعات پر مختصر تحریریں

---

[1] اصنافِ ادب۔ رفیع الدین ہاشمی ص ۱۴۸

مضمون ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین اس بارے میں لکھتے ہیں۔

"ہر وہ بات یا خیال جو نثر میں پیش کیا جاتے عام زبان میں مضمون سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ یہ مضمون بڑا گول سا لفظ ہے اس میں ویسا ہی ابہام ہے جو لفظِ کہانی میں ہے۔ ہر ایسی بات جس میں کوئی قصہ بیان کیا گیا ہو کہانی ہو جاتی ہے۔ یہ میر حسن کی سحر البیان ہو یا نذیر احمد کا ابن الوقت، سرشار کا فسانۂ آزاد ہو یا امتیاز علی کی انارکلی، پریم چند کا آخری تحفہ ہو یا سردار جعفری کی نئی دنیا کو سلام۔ بنیادی طور پر یہ تحریریں کسی قصہ یا واقعہ سے متعلق ہیں۔ ان قصوں کی نوعیت گرچہ مختلف ہے مگر ان سب میں ایک بنیادی عنصر موجود ہے جو کہانی ہے۔ اس لحاظ سے ان مختلف تحریروں کو کہانی سے موسوم کرنا حق بجانب ہے مگر ادب کی اصطلاح میں ایسا خیال کرنا درست نہ ہوگا۔ کہانی ہوتے ہوتے بھی یہ صورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ ان میں سے ہر صورت کی ایک مخصوص صنفی حیثیت ہے۔ یہی حال مضمون کا ہے۔ لفظ کہانی کی طرح یہ بھی ایک گول سا لفظ ہے اس کے دائرے میں بہت سی باتوں کے سما جانے کی خاصی گنجائش ہے۔ لیکن ایک متعلم ادب کا ان مختلف تحریروں کو مضمون سے یاد رکھنا اس کی لاعلمی کا ثبوت ہوگا۔"[1]

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف مضامین کی موضوعات کے لحاظ سے درجہ بندی کی جاتے اور مضمون کی اصطلاح کے ساتھ تاریخی، تنقیدی، سوانحی، اصلاحی، معاشرتی وغیرہ کے سابقے بالالتزام استعمال کیئے جائیں اور ان کے لکھنے والوں کو ان کے

---

[1] ادب کی ایک خاص صنف انشائیہ۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین۔ نگار پاکستان کراچی۔ اصنافِ ادب نمبر ۱۹۶۶ء صـ ۱۲۶

موضوعات کے حوالے سے مؤرخ، نقاد، سوانح نگار، مصلح وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا جاتے۔ یہ درجہ بندی اس لیے بھی ضروری ہے کہ موجودہ صورت میں جب تک سارا مضمون پڑھ نہ لیا جائے یہ واضح نہیں ہوتا کہ مضمون اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے ادب کی کس شاخ سے متعلق ہے اگر مضمون کے ساتھ تنقیدی، تاریخی، سوانحی اور فکری وغیرہ کے سابقے لگا دیتے جائیں تو مضمون پڑھے بغیر بھی ان کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ زیر نظر مقالہ کا موضوع چونکہ انشائیہ نگاری ہے اس لیے اس میں مختلف مضمون نگاروں کا اسی حیثیت سے جائزہ لیا جاتے گا۔ اور صرف انہی مضامین سے سروکار رکھا جائے گا جن میں انشائیہ کی خصوصیات موجود ہوں گی۔

اردو میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز عموماً سرسید سے تسلیم کیا گیا ہے۔ گزشتہ صفحات میں حامد حسن قادری کا جو اقتباس نقل کیا گیا اس میں بھی سر سید احمد خاں ہی کو اردو میں مضمون نگاری اور مقالہ نگاری کا بانی کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ بھی سر سید کو اردو کا پہلا مضمون نگار تسلیم کرتے ہیں۔

"اردو میں مضمون نگاری کے بانی بھی سر سید ہی تھے۔ ادب کی یہ صنف جس کا انگریزی نام Essay ہے یورپ ہی سے حاصل کی گئی ہے"۔ [1]

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا کہنا ہے۔

اردو ادبیات میں مضمون نگاری انگریزی ادبیات کے زیر اثر انیسویں صدی میں شروع ہوئی اور سر سید احمد خاں اردو میں اس صنف کا باقاعدہ آغاز کرنے والے تھے"۔ [2]

---

1. سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فکری اور فنی جائزہ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ص ۴۲
2. مضامین سر سید مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مکتبہ خیابان ادب لاہور۔ اول ۱۹۶۷ء مقدمہ ص ۶

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے بقول:

"اردو میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز سرسید احمد خاں سے ہوا۔ انھوں نے مذہبی، سیاسی، ادبی، علمی، معاشرتی، تاریخی، فلسفیانہ اور دیگر موضوعات پر بکثرت مضامین لکھ کر ہم عصر ادیبوں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔"[1]

مندرجہ بالا آراء کے مطابق سرسید احمد خاں اردو میں مضمون نگاری کا آغاز کرنے والے ہیں لیکن ڈاکٹر سیدہ جعفر کو اس بات سے اتفاق نہیں کہ سرسید احمد خاں اردو کے اولیں مضمون نگار ہیں۔ ان کے مطابق

"مضمون نگاری کے ارتقا میں سرسید کے مضامین ایک توسیع ہیں آغاز نہیں۔ ماسٹر رام چندر اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں۔ جنھوں نے شعوری طور پر اردو ادب میں اس صنف کی ابتدا کی۔ رام چندر نے مضمون کے فارم کو خیالات اور جذبات کے اظہار کا سہولت بخش اور غیر رسمی ذریعہ اظہار محسوس کرتے ہوئے اس صنف کو اپنایا تھا۔ سرسید احمد خاں کے مضامین اس ابتدا کا نکھرا ہوا اور ترقی یافتہ روپ ہیں۔"[2]

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی بھی رام چندر کی اولیت کے معترف ہیں۔

"اردو میں مقالہ نگاری کا آغاز ۱۸۴۵ء کے آس پاس ہو چکا تھا مگر اس

---

[1] اصناف ادب۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ص ۱۴۸

[2] ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر سلسلہ مطبوعات ابوالکلام آزاد اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد اوّل ۱۹۶۰ء ص ۵۲

کی مقبولیت کا عہد ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا۔ دلی کالج کے نصاب میں مختلف مضامین شامل تھے۔ امتحان کے پرچوں میں ایک پرچہ مقالہ نگاری سے متعلق ہوا کرتا تھا۔ اس دور کی مقالہ نگاری کا انداز مقالوں کے عنوانات سے ہو جاتا ہے۔ دو چار عنوان ملاحظہ فرمایئے۔ ۴۶ء کے امتحان میں حسب ذیل عنوان تجویز کیا گیا تھا۔ "بالائی (شمالی) ہندوستان پر ریلوے کے جاری ہونے کیا اخلاقی اثر پڑے گا۔" امتحان کے پرچوں میں مضمون نویسی کے علاوہ سالانہ مضمون نویسی کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا۔ ۵۰-۴۹ء کے لیے یہ موضوع تجویز کیا تھا۔ "اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادیٔ رعایا کے بارے میں کیا فرق تھا۔" اسی طرح ایک اور موضوع ملاحظہ فرمایئے "مختلف آزاد پیشے اور مفید کاروبار جو ہندوستانی دیسی ریاستوں میں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک کی کامیابی کے بہترین طریقے خواہ ابتدائی تربیت کے لحاظ سے یا بعد کی مساعی کے اعتبار سے۔" ۵۴ء کے سالانہ مقابلے کا عنوان بھی دیکھ لیجیے "شاہی اور مخلوط قسم کی حکومت میں کونسی بہتر ہے اور اس کی فضیلت کی کیا وجہ ہے۔" ان انگریزی اور اردو انعامی مقابلوں میں طلائی اور نقرئی تمغے دیئے جاتے تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ نے بھی اردو میں بہترین مقالے کے لیے ایک طلائی تمغہ حاصل کیا تھا۔ ان مقابلوں میں انعام پانے والے طلبہ میں ماسٹر رام چندر، موتی لال، نذیر احمد، محمد حسین، ذکاءاللہ، بھگوان داس، خواجہ ضیاءالدین خصوصیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے بیشتر فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسی کالج میں معلمی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انہی لوگوں کی مساعیٔ جمیلہ سے مقالہ نگاری نے رواج پایا۔ ماسٹر رام چندر نے "فوائد الناظرین" اور "محب ہند" ایسے دو رسالے بھی نکالے۔ ان میں علمی، ادبی، بحثیں اور مقالے

چھپتے تھے۔ مذکورہ رسالے کئی سال ادبی خدمت انجام دینے کے بعد ۵۵ء یا ۵۶ میں بند ہوگئے تھے۔[1]

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی بھی مضمون نگاری کے ضمن میں ماسٹر رام چندر کی اولیت پر صاد کرتے ہیں۔

"اردو نثر کی تاریخ میں رام چندر کی اولیت اور تقدامت مسلم ہے کہ انھوں نے علمی، تاریخی، معاشرتی اور اور سائنسی موضوعات پر سب سے پہلے مختصر مقالات (Essays) لکھے۔ اردو کے ذریعے سائنسی نقطۂ نظر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جدید تہذیب کی برکتوں سے لوگوں کو روشناس کرایا اور مشرق اور مغرب کی اعلیٰ اقدار میں امتزاج پیدا کیا۔ وہ نہ صرف مغربی علوم کے مبلغ تھے بلکہ انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے سائنسی طرز فکر، عقلیت اور حقیقت پسندی کے رجحانات کو اردو دان طبقے میں پھیلانے کی کوشش کی اور زندگی کے مسائل کو عقل کی کسوٹی پر جانچنے کی دعوت دی"[2]

لہٰذا اب اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ماسٹر رام چندر اردو کے اولین مضمون نگار ہیں جنھوں نے انگریزی ادب کے زیر اثر مختلف موضوعات پر سب سے پہلے مختصر مضامین لکھنے کا آغاز کیا اور بعض انگریزی مضامین کا اردو میں ترجمہ پیش کیا۔ گویا مضمون نگاری کے حوالے سے ماسٹر رام چندر، سرسید احمد خاں کے پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ماسٹر رام چندر کے مضامین ادبی لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کے مضامین میں وہ سلاست اور روانی

---

[1] اردو الیسیز مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی ص۲۴-۲۳

[2] مولوی نذیر احمد دہلوی - احوال و آثار - ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی - مجلس ترقی ادب - لاہور اول ۱۹۷۱ء ص۶۳

نہیں جو سرسید احمد خاں کے مضامین میں پائی جاتی ہے۔ رام چندر کے مضامین کی زبان پاکیزہ ہے۔ انھوں نے انگریزی سے جو مضامین اردو میں منتقل کیے وہ لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں یہی نہیں بلکہ ان کے طبعزاد مضامین پر بھی ترجمہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ مگر ان خامیوں کی وجہ سے ان کی اولیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ زبان و بیان کی تمام تر خامیوں کے باوجود وہ اردو کے پہلے مضمون نگار کہلانے کے مستحق ہیں کیونکہ یہ اصطلاح بھی سب سے پہلے انھی نے اپنی تحریروں کے لیے استعمال کی۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر اس ضمن میں لکھتی ہیں۔

• رام چندر کے طرزِ تحریر پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے اپنی ان تحریروں کیلئے کونسی اصطلاح استعمال کی جو وقتاً فوقتاً محبِ ہند اور فوائد الناظرین میں شائع ہوا کرتی تھیں رام چندر نے اپنی ان تحریروں کو مضمون ہی لکھا ہے۔ انھیں اس کا پورا پورا احساس تھا کہ وہ مضمون یعنی Essay لکھ رہے ہیں۔ اپنے تمام رسالوں میں انھوں نے ان مضامین کو کسی اور اصطلاح سے نامزد نہیں کیا۔ رام چندر نے اکثر مضامین کے عنوانات میں بھی یہی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مثلاً مارچ سنہ ۱۸۵۱ء کے فوائد الناظرین ایک ایسے کا عنوان انھوں نے "مضمون" ہی رکھا ہے۔ اسی طرح جون سنہ ۱۸۵۱ء کی ایک اور سرخی "بقیہ مضمون" ہے اور اسی طرح جولائی کے فوائد الناظرین میں "مضمون لائق توجہ ناظرین کے" یا اسی سال کے اگست کے شمارہ میں "ترجمہ ایک مضمون کا انگریزی سے جس کو ایک فاضل نے اپنی کتاب میں لکھا ہے" یا نومبر سنہ ۱۸۵۱ء میں "مضمون ہماتش" اس سلسلہ میں قابلِ غور ہیں۔ یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ رام چندر نے موضوع کے لیے مضمون کا لفظ استعمال کیا ہوگا۔ لیکن فوائد الناظرین میں ان کی تحریروں کا مطالعہ کرنے سے اس خیال کی تردید

ہوتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ رام چندر نے لفظ مضمون انگریزی کے ایسے
کے لیے استعمال کیا ہے۔ جس سے ایک خاص صنفِ ادب مراد ہے۔
ذیل میں ان کے مختلف مضامین سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

مکاری کی برائیوں پر ایک سیر حاصل مضمون لکھتے ہوئے آخر میں تحریر کرتے ہیں۔ پس نتیجہ اس سارے مضمون کا یہ ہے کہ جس وقت کوئی شخص جانے کہ فلاں نیکی میں مشہور ہونے سے فائدہ ہوگا "تو اسے لازم ہے کہ اس نیکی کا حقیقت میں استعمال کرنے لگے۔

(جنوری ۱۸۴۷ء ج۔ پ۔ ص)

یا اسی طرح حسد کی برائیوں کو بے نقاب کرتے ہوتے مضمون کے آخر میں رقمطراز ہیں نتیجہ اس تمام مضمون سے یہ نکلتا ہے کہ کسی شخص کو حسد نہ کرنا چاہیے اور اس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ حسد کرنے سے سوائے رنج اور گناہ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

(مارچ ۱۸۴۷ء ج۔ پ۔ ص)

محبِ ہند اور فوائد الناظرین کے علاوہ عجائباتِ روزگار اور تذکرۃ الکاملین میں بھی رام چندر کے مضامین ملتے ہیں۔ ان ادب پاروں کو بھی وہ مضمون کی اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں۔ رام چندر نے عجائبات روزگار میں مضامین کے لیے ایک علٰحدہ حصہ رکھا ہے اور "مضامین پسند آگیں" کے عنوان سے ایک باب صرف مضامین ہی کے لیے مختص کر دیا ہے۔

رام چندر کے پاس صنفِ مضمون کا ایک واضح اور صحیح تصور موجود تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے موضوع کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے لیکن جب وہ اس لفظ کو بطور اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو ان کی مراد ایسے مضمون سے ہوتی ہے۔ ذیل کے اقتباسات میں یہ لفظ اپنے وضعی اور

اصطلاحی دونوں معنوں میں برتا گیا ہے۔

نتیجہ اس تمام مضمون کا یہ ہے کہ انسان حتی المقدور عالی حوصلہ ہونے میں کوشش کرے۔ اگرچہ ہمیں اس مضمون پر بہت کچھ لکھنا تھا لیکن چونکہ ہمیں مضمون مرقومہ ذیل بھی ضرور درج کرنا تھا۔ اس واسطے اتنے ہی مضمون پر اکتفا کی گئی۔

(فوائد الناظرین یکم اپریل ۱۸۴۷ء ج۔ ن۔ ص ۵۵)

رام چندر نے یہ اصطلاح نہایت وسیع معنی میں استعمال کی ہے انھوں نے نہ صرف خالص ادبی موضوعات کیلئے اسے استعمال کیا ہے بلکہ ان کے یہاں تاریخی، جغرافیائی، کیمیائی اور دوسرے مضامین جو مساحت، نجوم، ہیئت، تصوف علم الاجسام، اخلاق، سماجی اصلاح اور حکمت وغیرہ سے متعلق ہیں ان کے لیے بھی یہی اصطلاح مستعمل ہوئی ہے۔

"مضمون لائق توجہ ناظرین کے" کے عنوان سے انھوں نے مختلف شماروں میں علمی مباحث اور سائنٹفک موضوعات پر مضمون لکھے ہیں اور ان سب کو مضمون ہی کے زیر عنوان رکھا ہے۔ مثلاً جولائی سنہ ۱۸۵۱ء کے پرچے میں اسی عنوان کے تحت ستاروں کی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے "ستاروں کا بیان" عنوان قائم کیا ہے اسی سال کے اگست کے شمارے میں علم ہیئت پر ستمبر سنہ ۱۸۵۱ء میں تصوف پر اور نومبر میں فلسفہ پر مضامین لکھے ہیں"۔[1]

محولہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ ماسٹر رام چندر اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں جنھوں نے انگریزی ایسے کی تقلید میں اردو میں مختصر مضامین لکھنے کے علاوہ

---

[1] ماسٹر رام چندر اور اردو نثر ص ۷۸-۸۱

ایڈیسن وغیرہ کے مضامین سے اخذ و ترجمہ بھی کیا اور مضمون کی اصطلاح کو ایسّے کے معنی میں عام کیا مگر سوال یہ ہے کہ ان کے مضامین میں انشائی خصوصیات بھی موجود ہیں یا نہیں کہ دراصل یہی اس مقالے کا موضوع ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ماسٹر رام چندر کے مضامین کو علمی مضامین، عام مضامین، اخلاقی اصلاحی اور سماجی مضامین، تاریخی مضامین اور سوانحی مضامین کے ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے اور اپنی کتاب کے آخر میں کچھ منتخب مضامین بھی شامل کیے ہیں جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رام چندر نے ادبی مضامین کی طرف بالکل توجہ نہیں دی اور اپنی ساری صلاحیتیں علمی سائنسی اور معاشرتی مضامین لکھنے میں صرف کر دیں۔ خود سیدہ جعفر کو بھی اس حقیقت کا اعتراف و احساس ہے لکھتی ہیں۔

"رام چندر کی مضمون نگاری میں خود مصنف کی شخصیت کے خدوخال نہیں ابھرتے اور نہ ان کے مضامین میں قلبی تاثرات اور احساسات کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ رام چندر جس موضوع پر بحث کرتے ہیں اس کا ہر پہلو ان کی نگاہ کے سامنے ہوتا ہے اور ان کی نظر تمام جزئیات کا احاطہ کر لیتی ہے۔ لیکن رام چندر کے مضامین میں وہ لمحے بہت کم دکھائی دیتے ہیں جب ادیب اپنے احساسات اور اپنے فن کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے[1]"

چنانچہ ماسٹر رام چندر کے مضامین متنوع ہونے کے باوجود ادبی خصوصیات سے محروم ہیں اور چونکہ ان کے مضامین ادبیت سے محروم ہیں اس لیے انھیں انشائیہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار "رام چندر کے ان مضامین کو ہم باقاعدہ ادبی مضمون نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم انھیں بے قاعدہ مضامین کی صف میں شمار کر سکتے ہیں کیونکہ انھوں نے اخلاقی

---

[1] ماسٹر رام چندر اور اردو نثر ص۸۷

اور اصلاحی موضوعات کو علمی انداز میں پیش کیا ہے۔ ادبی انداز میں پیش کرنا شاید ان کا مقصود بھی نہیں تھا اور غالباً وہ اس پر قادر بھی نہیں تھے۔ ماسٹر رام چندر کا نثر سراسر علمی نثر ہے جس میں وضاحت اور صراحت ان کے پیش نظر رہتی ہے اور یہ علمی نثر بھی ابھی تجربہ گاہ کی منزل سے گزر رہی تھی [1]"

یہ حقیقت تسلیم کر لینے کے باوجود کہ ماسٹر رام چندر مضمون نگاری میں سر سید احمد خاں کے پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مضمون نگاری میں اصل اہمیت سر سید احمد خاں ہی کو حاصل ہے۔ کیونکہ اردو نثر اور مضمون نگاری کی ترویج و ترقی میں نمایاں کام سر سید احمد خاں ہی کا ہے۔ سر سید احمد خاں نے ہی اردو میں باقاعدہ مضمون نگاری کی تحریک شروع کی اور خود اتنی زیادہ تعداد میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھے کہ نہ صرف مضمون نگاری اردو ادب کی ایک اہم اور مستقل صنف کی حیثیت اختیار کر گئی بلکہ اردو نثر کے سامنے نئے افق بھی روشن ہوتے چلے گئے۔ اگرچہ سر سید سے پہلے فورٹ ولیم کالج کے مولفین اردو نثر میں سادگی کی بنیاد رکھ چکے تھے خصوصاً میر امن کی "باغ و بہار" اردو نثر کی ترقی میں وہ اہم سنگ میل ہے جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ غالب کے خطوط کی سادہ اور شگفتہ نثر نے بھی اردو نثر کی ترقی کو مہمیز لگائی یوں غیر شعوری طور پر اردو نثر نے ترقی کی کچھ منازل طے کر لی تھیں۔

خود سر سید احمد خاں کے سامنے بھی یہ نمونے موجود تھے اور انھوں نے اس سے استفادہ بھی کیا مگر فورٹ ولیم کالج کا مقصد اردو نثر یا اردو ادب کی ترقی کی بجائے انگریز کارکنوں کو اردو زبان سے آشنا کرنا تھا۔ اسی مقصد کے لیے آسان اور روزمرہ بول چال میں کتابیں ترجمہ و تالیف کرانے کا کام شروع کیا گیا یہ الگ بات کہ جو کام سیاسی مقاصد کے تحت کیا گیا اس سے بالواسطہ اردو نثر اور اردو ادب کو فائدہ پہنچ گیا۔ غالب

---

[1] مضامین سر سید مرتبہ غلام حسین ذوالفقار۔ مقدمہ ص ۵

کے سامنے بھی اردو نثر کی ترقی کا کوئی منصوبہ نہ تھا انھوں نے محض سہولت اور کسی حد تک تفنن طبع کے طور پر اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے بول چال کی زبان میں خطوط لکھ کر مراسلہ کو مکالمہ بنانے کی کوشش کی۔ یوں غالب کی انفرادیت پسندی نے بھی اردو نثر کی ترقی میں بالواسطہ ہی حصہ لیا۔ مگر سر سید احمد خاں نے باقاعدہ سوچ بچار کے بعد ایک واضح منصوبے کے تحت اردو نثر اور اردو ادب کی ترقی کے لیے کام کیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اردو کی قدیم مقفیٰ طرز نگارش کو بیک جنبش قلم مسترد کرتے ہوئے انگریزی نثر کی طرز پر اردو میں سادہ نویسی کی تحریک کا آغاز کیا۔ موضوعات کی تنگ دامنی کو محسوس کرتے ہوئے مختلف موضوعات پر مختصر مضامین و مقالات لکھ کر اردو دانوں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔

چنانچہ سر سید احمد خاں ہی صحیح معنوں میں جدید اردو نثر اور مضمون نگاری کے بانی کہلانے کے مستحق ہیں باوجود اس کے کہ رام چندر کو مضمون نگاری میں زمانی لحاظ سے ان پر تقدم حاصل ہے مضمون نگاری کو باقاعدہ صنفِ ادب کا رتبہ سر سید احمد خاں ہی نے عطا کیا۔ تاہم اس بات پر غور کیا جا سکتا ہے کہ انکے مضامین میں انشائی اوصاف کس حد تک پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے میں:

"سید صاحب کے سارے مضامین باقاعدہ Essay کی حد میں داخل نہیں ہو سکتے۔ مگر مضامین کی کافی تعداد ایسی ہے جن کو اس صنف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً تہذیب الاخلاق کے مندرجہ ذیل مضامین، تعصب تعلیم و تربیت۔ کاہلی۔ اخلاق۔ ریا۔ مخالفت۔ خوشامد۔ بحث و تکرار سولزیشن۔ اپنی مدد آپ۔ سمجھ۔ گزرا ہوا زمانہ۔ امید کی خوشی۔ رسم و رواج کے نقصانات۔ عورتوں کے حقوق۔ انسان کے خیالات۔ آزادی رائے۔ تربیتِ اطفال۔ سرابِ حیات۔ خود غرضی اور قومی ہمدردی۔ آخری پرچہ تہذیب الاخلاق ان سب مضامین میں ان کا اختصار قدر مشترک ہے۔ جو

ایک باقاعدہ مضمون کا بنیادی وصف ہے۔ سرسید کے بعض مضامین میں یہ وصف اور اس کے ساتھ ساتھ مضمون کی سی جزویت اور ناتمامیت بھی پائی جاتی ہے۔ ایک اچھا مضمون اصولاً کسی مرکزی موڈ کا متقاضی ہوتا ہے جس کے ارد گرد خیالات کا تار و پود خود بخود تیار ہوتا جاتا ہے۔ اچھا مضمون کڑی منصوبہ بندی یا پہلے سے مرتب کئے ہوئے خیالات کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کی تہیں خود بخود کھلتی جاتی ہیں سرسید کے بعض مضامین یہ خوبی بھی پائی جاتی ہے مثلاً امید کی خوشی، بحث و تکرار اور گزرا ہوا زمانہ۔ ان مضامین میں یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ ان میں معلومات تعمیری کی بجائے تخیلات کا غلبہ ہے۔ یوں سرسید کے مضامین کی معلوماتی سطح عموماً کرخت ہوتی ہے مگر اچھے مضامین میں وہ تصویریں اور خوشنما نقوش تیار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً مضمون "سراب حیات" میں صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے، سے ابتدا کی گئی ہے۔ اس کے بعد عمدہ مکالمہ آتا ہے۔ ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ تصویریں بنتی جاتی ہیں۔ نقوش ابھرتے جاتے ہیں، پڑھنے والے کا دل مضمون کی تہوں میں الجھتا چلا جاتا ہے اور بات دل میں بیٹھتی جاتی ہے اور مجموعی تاثر پرمسرت ہوتا ہے۔ یہ ایک عمدہ مضمون کی بنیادی خوبی ہے۔ اور یہ خوبی سید صاحب کے بعض مضامین میں مل جاتی ہے۔

بایں ہمہ سید صاحب کے اکثر مضامین میں بعض کمزوریاں ایسی پائی جاتی ہیں جن کے سبب سے ان کو معیاری مضامین کی صف میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ اوّل تو ان کے تمام مضامین طویل ہوتے ہیں۔ پھر ان میں علمی و اصطلاحی معلومات کی بھرمار اس قدر ہوتی ہے اور منصوبہ بندی اتنی سخت ہوتی ہے کہ مضمون پُر لطف نہیں رہتے۔ علمی مقالات یا علمی بحث کے اعتبار سے

ان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا مگر مضمون کی سی شگفتگی ان میں نہیں پائی جاتی
اس کے علاوہ سرسید کے مضامین میں بے حد سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ اکثر مضامین
ان کی حیثیت معلم اخلاق کی ہے ادیب کی نہیں۔ اصولاً ادب اور اخلاق
میں کوئی تضاد نہیں مگر اخلاق کی کھلی تلقین ایک غیر ادبی طریقہ خطاب ہے۔
انگریزی زبان کے بلند پایہ مضمون نگار پہلے ادیب تھے پھر مصلح مگر سرسید
سب سے پہلے مصلح تھے پھر کچھ اور تھے اس کی ذمہ دار ان کی مقصدیت
اور ان کے زمانے کا ماحول تھا۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

کہنے کو سرسید کی مضمون نگاری ایڈیسن وغیرہ سے متاثر ہوئی ہے مگر ان کے
مضامین میں وہ روح بہت کم ہے جو ایڈیسن کے اس مقولے میں ہے کہ میرا
مقصد ہے To enliven morality with wit
and to temper wit with morality
یعنی سرسید کے الفاظ میں اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈال دوں گا۔ اور
خوش طبعی کو اخلاق سے ملا دوں گا۔ سرسید کے مضامین میں ظرافت کے کچھ
انداز ضرور پائے جاتے ہیں مگر وہ خوش کیفیتی جس سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہو
شاذ و نادر ہی محسوس ہوتی ہے سرسید کے مضامین میں تصورات اور معقولات کا
غلبہ ہے۔ زندگی کی خوش نما اور دلچسپ تصویریں کم ہیں۔ وہ زندگی کے
خیال انگیز اور دلچسپ مناظر کم پیش کرتے ہیں۔ اعمالِ انسانی اور ان کے مادی
فوائد و نقصانات کی فہرستوں یا ان کی معقول توجیہات پر بہت زور دیتے ہیں
وہ ہر چند نیچر کے دلدادہ ہیں اور استدلال میں اس سے فائدہ بھی اُٹھاتے
ہیں مگر نیچر کے وسیع مرغزاروں کی سیر نہیں کراتے۔
ان سب باتوں کے باوجود سرسید اردو کے اولین مضمون نگار ہیں۔ اولین

اس معنی میں کہ انھوں نے سب سے پہلے شعوری طور پر مضمون یا Essay
کی صنف کو اختیار کیا اور براہ راست انگریزی زبان کے مضمون نگاروں سے اثر
قبول کیا اور آنے والے مضمون نگاروں کے لیے شاہراہیں متعین کیں اور اس
میں کچھ شبہ نہیں کہ انھوں نے اپنے پرچہ تہذیب الاخلاق کے ذریعے ہندوستان
کے تعلق میں خصوصاً اردو کی سادہ نثر کی ترویج کے معاملے میں تقریباً ویسی ہی
خدمات انجام دیں جیسی انگلستان میں ایڈیسن اور اسٹیل نے سپکٹیٹر اور
ٹیٹلر کے ذریعے انجام دی تھیں اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سرسید کی مضمون
نگاری مذکورہ بالا ادیبوں کی مضمون نگاری سے کوئی خاص مماثلت نہیں رکھتی۔
سرسید کو انگریزی مضمون نگاروں میں سے اگر کسی سے کچھ مماثلت ہے تو وہ
بیکن ہے جو انگریزی زبان میں مضمون نگاری کی صنف کا بانی ہے۔"[1]

سرسید احمد خاں کی مضمون نگاری اور مضمون نگاری میں ان کے مقام و مرتبہ کے سلسلہ میں
ڈاکٹر سید عبداللہ کی مندرجہ بالا رائے پر کسی قسم کا اضافہ کرنا تو شاید غیر ضروری ہو کیونکہ انھوں نے
تفصیل سے سرسید احمد خاں کے موضوعات و اسالیب پر اظہار خیال کیا ہے اور جو نتائج اخذ
کیے ہیں وہ معقول اور قابل قبول ہیں۔ البتہ اس بات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ
نے سرسید احمد خاں کے جن مضامین کو ایسے کی صف میں شامل کیا ہے وہ کہاں تک ایسے
کے معیار کے مطابق ہیں۔ ایسے کا ایک تصور تو وہ ہے جس کی سرحدیں مقالہ نگاری سے ملی
ہوئی ہیں اور جس کے تحت ہر قسم کے مضامین آجاتے ہیں۔ اگر ایسے کے اس معیار پر سرسید
کے مضامین کو پرکھا جائے تو ان کے سبھی مضامین اس ذیل میں آجاتے ہیں لیکن چونکہ ڈاکٹر
سید عبداللہ نے صرف گنتی کے چند مضامین کو ایسے کہا ہے اس لیے گمان گزرتا ہے کہ انھوں نے

---

[1] سرسید احمد خاں اور ان کی امور رفقا کی نثر۔۔۔۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۴۳-۴۶

اپنے کو خالص ایسے یعنی انشائیہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے ایک ایک مضمون کی جو خوبیاں گنوائی ہیں وہ تقریباً انشائیہ کی خوبیاں ہیں۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مضامین پر ایک نظر ڈالی جائے جنھیں ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایسے یعنی انشائیہ کہا ہے۔

سب سے پہلے "تعصب" کو لیجیے۔ یہ ایک مقصدی مضمون ہے جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ مسلمانوں کو تمدن و معاشرت ہی نہیں بلکہ مذہب کے معاملے میں بھی رواداری اور وسیع المشربی کا مسلک اپنانا چاہیے۔ چونکہ راسخ العقیدہ مسلمان اپنے عقیدہ کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتا اور اس معاملے میں کافی متعصب ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے اس مضمون میں مذہبی تعصب کو شیطان کا ایک داؤ قرار دیتے ہوتے اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس مضمون میں عقلی استدلال سے کام لیا گیا ہے جو انشائیہ کی روح کے منافی ہے حتیٰ کہ براہِ راست خطابت تک موجود ہے جو ادبی تاثر کو کم کرتی ہے۔ البتہ اختصار کا حامل ہے اور اسلوب ان کے عام مضامین کے مقابلے میں نسبتاً بہتر ہے لیکن محض اس بنا پر اسے انشائیہ نہیں کہہ سکتے۔

"تعلیم و تربیت" کا مرکزی خیال یہ ہے کہ تعلیم و تربیت ہم معنی نہیں بلکہ دو الگ الگ چیزیں ہیں اور مسلمانوں کی تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ ان کی تربیت تو ہوتی ہے لیکن انھیں تعلیم نہیں دی جاتی۔ اس مضمون میں بھی استدلال سے کام لیا گیا ہے اور براہِ راست خطابت کا انداز بھی موجود ہے۔

"کاہلی" بھی اگرچہ بنیادی طور پر مقصدی مضمون ہے مگر اس میں عمومی کاہلی کی بجائے دل کی کاہلی کو موضوع بنایا گیا ہے اور کاہلی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے گریز کیا گیا ہے لہٰذا اس مضمون کو انشائیہ سے قریب کہہ سکتے ہیں۔

"اخلاق" ایڈیسن کے ایک مضمون پر تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ایڈیسن کی اس رائے سے اختلاف کیا گیا ہے کہ صاحبِ کمال آدمی کو اعتقاد اور اخلاق دونوں پر کاربند

ہونا چاہیئے۔ سرسید کے خیال میں اعتقاد کو خیال سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ مضمون بھی سرسید کے انہی اصلاحی مضامین میں سے ایک ہے جن کا مقصد مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے رویئے کے لحاظ سے یہ مضمون نقد و تبصرہ کے ذیل میں آتا ہے۔

"ریا" ایک ایسا مضمون ہے جس میں اخلاق سدھارنے اور ریا سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے البتہ اسلوب نسبتاً ادبی ہے اور خطابت کے سُر بھی ذرا دھیمے ہیں۔ لیکن استدلالی رویہ کے باعث انشائیہ سے دور ہو گیا ہے۔

"مخالفت" مختصر مضمون ہے جس میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ محض مخالفت برائے مخالفت میں غلو کرنا کمینہ اور بدذات لوگوں کا کام ہے۔ یہ مضمون بھی واضح طور پر مقصدی اور مدلل ہے۔

"بحث و تکرار" بھی اصلاحی مضمون ہے جس میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مہذب آدمیوں کو کتوں کی طرح لڑنا زیب نہیں دیتا۔ اگرچہ اس مضمون کا ابتدائیہ خاصا شگفتہ اور بے ساختہ ہے مگر آگے چل کر براہِ راست وعظ پر اتر آتے ہیں۔ بہر حال ابتدائیہ میں جزوی طور پر انشائیہ کا انداز موجود ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے "سولزیشن" کو بھی ایسے کے زمرے میں شامل کیا ہے حالانکہ "سولزیشن" تو باقاعدہ مقالہ ہے جو تمہید کے علاوہ پانچ ذیلی عنوانات میں منقسم کیا ہے حیرت ہے ڈاکٹر سید عبداللہ سے یہ سہو کس طرح ہوا کہ وہ اسے بھی ایسے کے دائرے میں شامل کر بیٹھے۔ تعصب، تعلیم و تربیت۔ کاہلی۔ اخلاق۔ ریا۔ مخالفت اور بحث و تکرار میں اور کچھ نہیں تو اختصار قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور غالباً اسی بنا پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے انھیں ایسے کہا ہے مگر سولزیشن تو اس خوبی سے بھی معرا ہے اور خاصی طوالت لیے ہوتے ہے۔

"اپنی مدد آپ" بھی مقصدی اور اصلاحی مضمون ہے۔ جس کا مرکزی خیال یہ ہے۔

Scanned by CamScanner

کرکوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک قوم کے افراد میں اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا نہ ہو۔

اسی طرح "سمجھ" بھی اصلاحی اور مقصدی مضمون ہے جس میں سمجھ یعنی قوتِ تمیز کو نیکی اور کمال بتاتے ہوئے مکر اور چالاکی کی مذمت کی گئی ہے۔ یہ ایک سنجیدہ مضمون ہے جس میں نتائج تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "گزرا ہوا زمانہ" کا مرکزی خیال بھی یہی ہے کہ قومی بھلائی سب نیکیوں سے بڑی نیکی ہے اور انسان کو چاہیے کہ قومی بھلائی کے کاموں میں کوشش کرے۔ یہ مضمون بھی اِن کے دیگر مضامین کی طرح اصلاحی مقصد لیے ہوئے ہے۔ یہی نہیں کہ اس مضمون میں نیکی کی زبانی قومی بھلائی کی تلقین کی گئی ہے بلکہ آخر میں براہِ راست وعظ بھی موجود ہے۔ مگر چونکہ اس مضمون میں سرسید احمد خاں نے تمثیل نگاری سے کام لیا ہے۔ اختصار کے علاوہ اسلوب بھی نکھرا نکھرا ہے۔ عقلیت کے ساتھ ساتھ جذبہ اور احساس کی بھی کارفرمائی ہے اس لیے ذاتی وابستگی، تخیلاتی فضا اور داخلی آہنگ کے باعث یہ بھی اپنے اندر کچھ انشائی عناصر رکھتا ہے۔

"گزرا ہوا زمانہ" کی طرح "امید کی خوشی" میں بھی مقصدیت پس پردہ ہے اور اسلوب حیرت انگیز طور پر ادبیت کا حامل ہے۔ جزویت اور خیالات کی ڈھیلی گرفت کے باعث اس میں بھی انشائیہ کا انداز موجود ہے۔ اگرچہ براہ راست اندازِ تخاطب نے انشائیہ کے مزاج کو مجروح بھی کیا ہے۔

"رسم و رواج" جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے رسم و رواج کے نقصانات پر مدلّل مضمون ہے۔

"عورتوں کے حقوق" بھی مدلّل مضمون ہے۔ جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مذہب اسلام نے عورتوں کو جتنے حقوق دیتے ہیں اتنے کسی اور مذہب نے نہیں دیتے مگر مسلمان جہالت اور رسم رواج کی پابندیوں کی وجہ سے ان حقوق

کو ادا نہیں کرتے جس سے دوسری اقوام یہ تاثر لیتی ہیں کہ مذہب اسلام میں عورت کو حقیر سمجھا جاتا ہے ۔ چونکہ اس مضمون میں بھی مقصد بے حد واضح ہے اور اسلام میں عورتوں کے حقوق کا تربیت یافتہ یورپ میں عورتوں کو دی گئی مراعات سے تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے لہذا اسے انشائیہ سے کوئی نسبت نہیں ۔

"انسان کے خیالات" کا خلاصہ یہ ہے کہ علم یا یقین یا ایمان کا مدار صرف عقل پر ہے ۔ اگرچہ اس مضمون میں بھی عقلی استدلال موجود ہے مگر نقطۂ نظر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی گئی ۔ اختصار بھی ہے اور بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے ۔ کسی حد تک شخصی نقطۂ نظر اور ذاتی تاثرات کا عکس بھی نظر آتا ہے ۔ اس لحاظ سے یہ مضمون انشائیے کے خاصا قریب ہے ۔ "آزادی رائے" مدلل مضمون ہے جس میں یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو ہر معاملے میں آزادی رائے کا حق حاصل ہے ۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنے کی کوشش کرے، حتّیٰ کہ مذہب کے معاملے میں بھی اس کی گنجائش نہیں۔

"تربیت اطفال" کے اسلوب میں بھی اگرچہ ادبیت موجود ہے لیکن نہایت مدلل مضمون ہے جس میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت خصوصی توجہ کی مستحق ہے اور اس بات پر اظہار افسوس کیا گیا ہے کہ مسلمان اپنے بچوں کو ایسی مذہبی تعلیم دلواتے ہیں جو ان میں تعصب اور مذہبی تنگ نظری پیدا کرتی ہے ۔ یہ مضمون ان کے تعلیمی نظریات کی تبلیغ کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے ۔

ایک اقتباس دیکھئے ۔

"ظاہری اخلاق اور مودبانہ حرکات اوپر اوپر مثلِ روغن قاز کے نہ لگائے جاویں، بلکہ مثلِ چشمہ شیریں کے خود اندر سے نکلیں ۔ نماز، روزہ اور کتبِ مذہبی کا پڑھانا فی نفسہٖ نہایت عمدہ چیز ہے ، مگر جب اس کی تعلیم ایسے

Scanned by CamScanner

بد طریقے سے ہوتی ہے جیسے کہ اب مسلمانوں میں مروّج ہے اس
سے بجز اس کے کہ بد تعصبات بڑھ جائیں اور بعوض نیکی اور نیک دلی
کے صفات ذمیمہ ترقی پکڑیں اور مثل کانٹے دار سخت پوست کے دل
کو گھیر لیں، جس سے نیکی اور رحم اور صداقت اور ہمدردی، سچائی
اور راست بازی مطلق اثر کرنے نہ پائے اور کچھ نتیجہ نہیں ہوتا۔ ایسا
تربیت یافتہ شخص بجائے اس کے کہ فخرِ اسلام ہوتا ننگِ اسلام ہوتا ہے"۔ [1]

"سراب حیات" بھی مقصدی مضمون ہے، جس کا لب لباب یہ ہے
کہ زندگی صرف زندگی تک محدود ہے۔ مرنے کے بعد کیا نیک کیا بد، کیا انسان اور
کیا جانور سب برابر ہیں۔ سو آپس کی ہمدردی اور قومی بھلائی ہی اصل چیز ہے۔
مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں۔

"یہ سب تمہارے خیالات ہیں کہ وہ شخص دنیا کی حسرت میں مرا اور
وہ شخص خدا کی عبادت میں، مرتے پر سب برابر ہیں۔ جو بات سچ ہے
وہ آپس کی ہمدردی، قومی اعانت، قومی بھلائی ہے۔ جبکہ ہماری قوم کا
دنیا میں یہ حال ہے کہ ذلّت و خواری، نکبت و جہالت میں مبتلا ہے
تو اگر کوئی دنیا کی حسرت میں مر کر جہنّم میں گیا تو ہماری جوتی سے اور
عبادت کر کر بہشت میں گیا تو ہماری بلا سے۔ ان کا کیا رونا، جیتوں کو
روؤ جو مردوں سے بھی بدتر ہیں"۔ [2]

چنانچہ سراب حیات کو بھی انشائیہ نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ اختصار اور

---

[1] مقالات سرسیّد مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ اوّل ۱۹۶۲ء (حصّہ ششم ص۲۲)

[2] مقالات سرسید مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب لاہور۔ اوّل ۱۹۶۳ء حصہ پانزدہم ص۲۴۲

ناتمامیت کی خصوصیت رکھتا ہے۔

"خود غرضی اور قومی ہمدردی" بھی مدلل مضمون ہے، جس میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ لوگ جنت میں جانے کے لالچ میں جو بظاہر نیکی کے کام کرتے ہیں۔ انہیں قومی ہمدردی کے کام کہنا درست نہیں کیونکہ جو کام ثواب کے لالچ میں کئے جائیں وہ عین خود غرضی پر مبنی ہیں۔ انہیں قومی ہمدردی سے کوئی علاقہ نہیں۔

"آخری پرچہ تہذیب الاخلاق" میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ تہذیب الاخلاق کے اجرا کے وقت جو مقصد پیشِ نظر تھا وہ خاصی حد تک پورا ہو گیا ہے، لہٰذا تہذیب الاخلاق بند کر کے اس سے زیادہ اہم قومی کاموں کی طرف توجہ کی جا رہی ہے۔

اس مختصر تجزیاتی مطالعہ کے بعد اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی کہ سر سید احمد خاں بنیادی طور پر مقالہ نگار تھے اور ان کی مقالہ نگاری قوم اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے وقف تھی۔ اصل میں ان کی حیثیت ایک مصلح کی ہے، جس کے سامنے قوم اور معاشرہ کی اصلاح کا ایک باقاعدہ منصوبہ تھا۔ ان کے لئے ادب یا مقالہ نگاری اس مقصد کے حصول کا ایک کارآمد ذریعہ تھا۔ اور انہوں نے اسی حیثیت سے اسے استعمال کیا۔ انہوں نے اپنے مضامین میں جذبے کے بجائے عقل اور منطق سے کام لیا ہے جس کے باعث ان کے مضامین بھی مختصر مقالے بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کی اصلاح پسندی نے ہی انہیں ایڈیسن اور اسٹیل کی تقلید پر مائل کیا۔ ورنہ اس وقت تک انگریزی ادب میں گولڈ سمتھ، چارلس لیمب، ولیم ہیزلٹ، لی ہنٹ اور سٹیونسن ایسے خالص انشائیہ نگار سامنے آچکے تھے۔ لیکن چونکہ سر سید احمد خان کا مقصد محض انشائیہ نگاری نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے ایڈیسن اور اسٹیل

کا تتبع کیا۔ جنہوں نے اپنے مضامین سے معاشرے کی اصلاح کا کام لیا ۔اگر
سرسید احمد خاں ایڈیسن اور اسٹیل کے مضامین کی روح تک رسائی حاصل
کر لیتے تو عین ممکن تھا کہ ان کے مضامین انشائیہ سے مزید قریب ہو جاتے ۔کیونکہ
ایڈیسن اور اسٹیل نے اصلاحی مضامین کے علاوہ انشائیے بھی لکھے ہیں ۔یہی
نہیں بلکہ ان کے اصلاحی مضامین میں بھی انشائیہ کا انداز موجود ہے ، مگر سرسید
احمد خاں کی مصلحانہ شخصیت ان کی ادبی شخصیت پر اس حد تک حاوی تھی کہ انہوں
نے ایڈیسن اور اسٹیل کی اصلاح پسندی کی تقلید پر ہی قناعت کر لی ۔
یہی وجہ ہے ان کے مضامین میں عام طور پر ادبی چاشنی نہیں ملتی ۔پھر بھی
"گزرا ہوا زمانہ" ۔ "امید کی خوشی" ۔ "انسان کے خیالات" اور کسی حد تک "کاہلی"
"خوشامد" اور "بحث و تکرار" اختصار ، جزویت ، خیالات کی ڈھیلی ڈھالی گرفت ،
تخیلاتی فضا اور جذباتی رویے کی بنا پر انشائیہ سے قدرے قریب ہیں اور
ان مضامین کو اردو انشائیہ کے اولین خام نمونوں کی حیثیت دی جا سکتی ہے ۔
ڈاکٹر سید عبداللہ نے جن مضامین کو انشائیہ قرار دیا ہے ان میں سرسید کا
مضمون "امید کی خوشی" تو شامل ہے لیکن وہ مضمون شامل نہیں جس کا عنوان صرف
"امید" ہے ، حالانکہ "امید" ایک ایسا مضمون ہے جس میں انشائیہ کے
اوصاف باقی مضامین کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہیں ۔ ایک مختصر اقتباس
ملاحظہ ہو ۔

"زندگی ایک بے جان چیز کی مانند ہے ، جس میں کچھ حرکت نہیں ہوتی ۔
امید اس میں حرکت پیدا کرتی ہے ۔ امید ہی کے سبب سے انسان
میں سنجیدگی اور بردباری اور خوش مزاجی کی عادت ہو جاتی ہے ۔
گویا امید انسان کی روح کی جان ہے ۔ ہمیشہ روح کو خوش رکھتی

Scanned by CamScanner

ہے اور تمام تکلیفوں کو آسان کر دیتی ہے۔ محنت پر رغبت دلاتی ہے، اور انسان کو نہایت سخت اور مشکل کاموں کے کرنے پر آمادہ رکھتی ہے"۔ ؎۱

سوال پیدا یہ ہوتا ہے کہ کیا انشائیہ کے ان خام نمونوں کے پیشِ نظر سرسیّد احمد خاں کو اردو کا پہلا انشائیہ نگار کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے شعوری طور پر سب سے پہلے انگریزی ایسّے کی تقلید میں مضمون لکھنے کا آغاز کیا۔ مگر اپنی اصلاح پسندی کے سبب انہوں نے خالص انشائیہ نگاروں کے بجائے ایسے ادیبوں کی تقلید کی جنہوں نے ایسّے کے نام پر انشائیوں سے کہیں زیادہ اصلاحی مضامین قلمبند کیے۔ یہی وجہ ہے سرسید احمد خاں کے عمومی مضامین میں انشائیہ کے اوصاف نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پھر بھی ان کے ہاں ایسے مضامین مل جاتے ہیں جن میں موضوع کے ایک آدھ پہلو پر سرسری انداز میں اس طرح اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ شخصی زاویۂ نگاہ ابھر کر سامنے آگیا ہے۔ ایسے مضامین اختصار کے حامل بھی ہیں۔ اور ان میں مختلف موضوعات پر جس طرح اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اپنے زمانے کے لحاظ سے وہ موضوع کو نئے زاویے سے دیکھنے کی مثال بھی پیش کرتے ہیں۔ ان مضامین کی بنا پر سرسیّد احمد خاں کو اردو انشائیہ کا پیش رو قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ ملحوظ رہے کہ سرسیّد کے ایسے مضامین بھی جن میں انشائیہ کے بعض عناصر پائے جاتے ہیں اصلاحی مضامین کی روایت ہی سے منسلک ہیں، کیونکہ سرسیّد کے پیشِ نظر انشائیہ کا وہ تصوّر نہیں تھا جو آج اس اصطلاح سے مخصوص

؎۱ مضامین سرسیّد مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ص ۱۲۸

Scanned by CamScanner

ہے۔

سر سیّد احمد خاں کی مضمون نگاری کا جائزہ لینے کے بعد ان کے قریبی ساتھیوں کے نثری سرمایہ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

سر سیّد کے قریبی ساتھیوں میں عموماً نواب محسن الملک (سیّد مہدی علی) نواب وقار الملک (مولوی مشتاق حسین) مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ اور مولانا حالی کے نام لیے جاتے ہیں۔

نواب محسن الملک کی ادبی صلاحیتوں کا معتدبہ حصّہ قانون اور مذہب کی نذر ہوگیا۔ انہوں نے "تہذیب الاخلاق" کے لئے جو مضامین لکھے وہ سنجیدہ افادی مضامین کے زمرے میں آتے ہیں۔ البتہ ان کا ایک مضمون "موجودہ تعلیم و تربیت کی تشبیہہ" جو تمثیلی انداز میں لکھا گیا ہے خاصا پر لطف اور ادبی خوبیوں کا حامل ہے۔ لیکن اسے انشائیہ سے کوئی نسبت نہیں۔

نواب وقار الملک نے "تہذیب الاخلاق" کے لئے جو مضامین لکھے انہیں موضوع اور مواد کے لحاظ سے مذہبی اور سیاسی مضامین کہنا چاہیے لہٰذا ان کے مضامین کا انشائیہ کے نقطۂ نظر سے مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔

مولوی چراغ علی کی صلاحیتیں بھی زیادہ تر مذہبی موضوعات پر خامہ فرسائی میں صرف ہوئیں، لہٰذا وہ بھی ہمارے مطالعہ سے خارج ہیں۔

سر سیّد احمد خاں کے ساتھیوں میں مولوی ذکاء اللہ غالباً سب سے زیادہ کثیر التصانیف ہیں۔ "مبادی الانشاء" میں شامل ان کے بعض مضامین اختصار، اسلوب کی شگفتگی، جزویت اور نا تمامیت کے باعث انشائیہ کے کسی قدر قریب ہیں، خصوصاً "آگ" "مطالعہ کتب" "ذہانت اور تہذیب"

اور کتنا غلط خیال ہے کہ زمانہ برسر تنزل ہے"۔ موخرالذکر مضمون میں اگرچہ دلائل کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے، مگر اس کے باوجود اس میں جزوی طور پر انشائیہ کا انداز موجود ہے۔ "آگ" میں انہوں نے جس طرح موضوع کو نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے وہ انشائیہ ہی کا انداز ہے لہذا "آگ" کو جزوی طور پر انشائیہ کہہ سکتے ہیں۔

ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"آگ عجیب نامبارک اولاد ہے۔ پیدا ہوتے ہی ماں باپوں کو کھا جاتی ہے۔ جن لکڑیوں کی زناشوئی سے پیدا ہوتی ہے انہیں جلا کر خاک کر دیتی ہے اور آپ ماں باپوں کو مار کر زندہ رہتی ہے"۔ [1]

مولانا حالی کے مضمون "زبان گویا" میں اسلوب کی شگفتگی تو موجود ہے مگر براہ راست انداز اور مقصدیت اتنی نمایاں ہے کہ اسے انشائیہ کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا اور حالی کا یہ واحد مضمون ہے جو ادبی شان لئے ہوئے ہے، ورنہ ان کے سبھی مضامین براہ راست مدعا نگاری کی مثال پیش کرتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد بھی حلقۂ سرسید میں شامل تھے مگر ان کی شہرت کا دارومدار ان کی ناول نگاری پر ہے۔ انہوں نے جو چند ایک مضامین لکھے وہ انتہائی مدلل اور مقصدی ہیں، لہذا ان کا انشائیہ کے نقطۂ نظر سے مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔

شبلی نعمانی کا اسلوب دبستانِ سرسید کے برعکس دلکش اور ادبی

---

[1] داستان تاریخ اردو، حامد حسین قادری ص ۵۳۳

اور تنقیدی ہیں لہٰذا وہ بھی ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ شان کا حامل ہے، مگر موضوع و مواد کے لحاظ سے ان کے مضامین تاریخی تحقیق

اس مختصر تجزیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں اور ان کے بعض رفقاء کے چند ایک مضامین میں انشائیے کے بعض اوصاف منتشر حالت میں موجود تھے۔ مگر چونکہ وہ دور ہی مقصدیت اور اصلاح پسندی کا تھا۔ اس لئے انشائیے کی اکائی وجود میں نہ آسکی۔

محمد حسین آزاد رفقائے سرسید میں تو شامل نہیں۔ مگر چونکہ وہ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے اس باب میں ان کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ محمد حسین آزاد اس دور کے وہ نثر نگار ہیں جو اپنے منفرد اسلوب کی بنا پہ اردو ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے قدیم و جدید کے امتزاج سے ایک ایسا دلکش اسلوب بیان اختیار کیا جو صرف انہی سے مخصوص ہے اور انہی پر ختم ہو گیا۔ مہدی الافادی نے ان الفاظ میں آزاد کے اسلوب کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

"جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا، اردو کو انشا پردازی کے درجہ پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں۔

— سرسید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں، جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔" [1]

---

[1] افادات مہدی۔ مہدی الافادی۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور۔ چہارم ۱۹۴۹ء ص ۲۱۳

مضمون نگاری کے ضمن میں ان کی کتاب "نیرنگِ خیال" شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کر چکی ہے۔ نیرنگِ خیال، اردو نثر میں تمثیل نگاری [illegible] کے حوالے سے پہلی اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ رجب علی بیگ سرور کی کتاب "گلزارِ سرور" میں بھی تمثیل سے کام لیا گیا ہے، مگر جب بھی تمثیل نگاری کا ذکر آتا ہے ذہن محمد حسین آزاد کی "نیرنگِ خیال" کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ نیرنگِ خیال کے تقریباً سبھی مضامین انگریزی مضامین نگاروں جانسن اور ایڈیسن کے مضامین کا اردو ترجمہ ہیں اور اس کا اعتراف آزاد نے اپنے دیباچہ میں بھی کیا ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کے پیش نظر کہ آزاد نے انگریزی نثر نگاروں جانسن اور ایڈیسن کے خیالات کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ڈاکٹر آدم شیخ حسب ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں

۱۔ ان مضامین میں آزاد نے اپنے محسوسات کو کسی سے متاثر ہوئے بغیر قلمبند کیا ہے۔

۲۔ جذبات اور محسوسات کی ترجمانی کے لئے مناسب زبان استعمال کی گئی ہے

۳۔ یہ مضامین حکمت و اخلاق کی خیالی تصویریں ہیں۔ کہانیاں ہیں لیکن غور طلب

۴۔ استعارہ اور تشبیہ کی رنگینی تحریر میں موجود ہے۔

ان نتائج کی روشنی میں نیرنگ خیال کا مطالعہ کیجئے تو صریحاً یہ محسوس ہوگا کہ آزاد کے خیالات میں رنگینی، عمق اور وسعت ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات کو ادا کرتے وقت ندرتِ بیان، جدت، روانی اور جاذبیت کا خیال رکھا، زبان و بیان کی انہی خصوصیات کے حسین سنگم نے آزاد کے مضامین کو انشائیوں سے بہت قریب کر دیا ہے اور یہیں سے اردو انشائیہ نگاری کی روایت کا

آغاز ہوتا ہے"۔ ۱؎

ڈاکٹر آدم شیخ کی یہ رائے تو قرینِ قیاس ہے کہ نیرنگ خیال کے مضامین اپنی بعض خوبیوں کی بنا پر انشائیہ سے قریب ہیں، مگر ان کی یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ نیرنگ خیال سے اردو انشائیہ نگاری کی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ کیونکہ نیرنگ خیال کے مضامین میں ذاتی تاثرات و تجربات کے بجائے واقعاتی عنصر غالب ہے۔ اور تقریباً ہر مضمون میں کہانی کا انداز پایا جاتا ہے اور بقول ڈاکٹر محمد حسنین۔

" انشائیہ مضمون کے دائرے میں سما سکتا ہے، یہ کہانی کی صف میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا ــــ کہانی کا مغز پلاٹ یا ماجرا ہے۔ پتلا گاڑھا یا پیچیدہ پلاٹ۔ انشائیہ میں خیالات کی بے ربطی اور بے ترتیبی حُسنِ انشائیہ ہے۔ قصہ یا بیانیہ یا واقعہ نگاری سے انشائیہ میں سالمیت آجاتی ہے۔ جس سے تنظیمی وحدت پیدا ہو جاتی ہے جو نقصِ انشائیہ ہے انشائیہ کی دلکشی کی اصل وجہ انتشارِ خیال یا ذہنی آوارگی ہے"۔ ۲؎

مضامین آزاد میں انتشارِ خیال کے بجائے خیالات کی سالمیت اور کہانی کا سا ربط و توازن پایا جاتا ہے۔ پھر ان مضامین میں نہ تو لکھنے والے کی شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے اور نہ ہی اسلوب میں بے تکلفی پائی جاتی ہے، چنانچہ ان کے مضامین کو انشائیہ کہنا اور ان سے انشائیہ نگاری کی روایت کا آغاز سمجھنا درست نہیں، مگر چونکہ یہ مضامین شگفتہ انداز میں تحریر

۱؎ انشائیہ۔ ڈاکٹر آدم شیخ ص ۵۵۔ رائٹرس ایمپوریم لمیٹڈ بمبئی اوّل ۱۹۵۸ء

۲؎ صنف انشائیہ اور انشائیے۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین ص ۱۵-۲۶

کٹے گئے ہیں۔ اختصار اور ناتمامیت کی خصوصیت بھی بعض مضامین میں موجود ہے اور اسلوب نگارش بھی جاذب نظر ہے، اس لئے انہیں انشائیہ کے قریب کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ ان مضامین میں اصلاحی جذبہ ادب پر حاوی نہیں ہونے پاتا بلکہ قاری اسلوب کی دلکشی میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات اصلاحی مقصد پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ یوں اسلوب کی دلکشی جہاں ان مضامین کو ادبی سطح پر کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے، وہیں ان کے مقصد میں ناکامی کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ کیونکہ یہ سارے مضامین ایک خاص مقصد کے تحت لکھے گئے تھے۔ لیکن آزاد معاشرے کی اصلاح سے زیادہ اردو نثر کی ترقی کے خواہاں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو میں انگریزی طرز پر تمثیلی مضامین لکھے جائیں۔ مزید برآں وہ نہ تو اردو کی قدیم مقفیٰ انشا پردازی سے مطمئن تھے اور نہ دبستانِ سرسید کی عاری نثر کو درخوراعتنا سمجھتے تھے، بلکہ قدیم و جدید کو اس طرح ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ کہ ماضی سے رشتہ بھی منقطع نہ ہونے پائے اور مستقبل کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے اس کوشش میں وہ ایک ایسا اسلوب اپنانے میں کامیاب ہو گئے جس کی نظیر اردو نثر میں نہیں ملتی۔ "سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ" سے اقتباس دیکھئے۔

"سچ کے زور و طاقت کو کون نہیں جانتا۔ چنانچہ ملکۂ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے۔ اٹھی اور اپنے زور میں بھری ہوئی اٹھی۔ اسی واسطے بلند اٹھی۔ اکیلی آئی اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں آگے آگے فتح و اقبال نور کا غبار اڑاتے آتے تھے۔ اور پیچھے پیچھے ادراک پر پرواز تھا۔ مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی، مگر استقلال

رکاب پکڑے تھا۔ اور جو قدم اٹھتا تھا دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔
ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتے سے بھی
نہ ہٹ سکتا تھا۔

دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا۔ ملک کی ہر بات کی نقل کرتا تھا
اور نئے نئے سوانگ بھرتا تھا۔ تو بھی وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی
تھی۔ دنیا کی ہوا و ہوس، ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لیے
تھیں اور چونکہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا اسی لالچ کا مارا کمزور تابعداروں کی طرح
ان کے حکم اٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں اس کی بے معنی تھیں۔ اور کام بھی الٹ
پلٹ بے اوسان تھے کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنی شعبدہ بازی
اور نیرنگ سازی سے فتحیاب تو جلد ہو جاتا تھا۔ مگر تھم نہ سکتا تھا۔ ہوا و ہوس
اس کے یار وفادار تھے اور اگر کچھ تھے تو وہی سنبھالے رہتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی
آپڑتی تھی۔ اس وقت دروغ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے
لئے سر پہ بادل کا دھواں دھار بگڑ لپیٹ لیتا تھا۔ لاف و گزاف کو حکم
دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دو ساتھ
ہی دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں
طرح داری کی تلوار۔ بائیں ہاتھ میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی۔ غلط نما
تیروں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا و ہوس دائیں بائیں دوڑتے پھرتے
تھے۔ دل کی ہٹ دھرمی، بات کی پچ پیچھے سے زور لگاتے تھے۔
غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا اور باوجود
اس کے ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دور دور سے لڑائی ہو۔ میدان میں

اترتے ہی تیروں کی بوچھار کر دیتا تھا۔ مگر وہ بھی باد ہوائی، اٹکل پچو بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھہرتا تھا، دم بدم جگہ بدلتا تھا۔ کیونکہ حق کی کمان سے جب تیر نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا تو جھٹ تاڑ جاتا تھا۔ ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک، بجلی کی تلوار نہ تھی۔ تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا۔ اور رعب خداداد کا خود سر پر دھرا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتحیاب ہوتی تھی تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک بے حیائی کی ڈھال منہ پر لے، ہوا و ہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشانِ لشکر گر پڑتا تھا۔ اور لوگ پھریرا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے"۔ لے

اپنے منفرد اسلوب بیان کے سبب محمد حسین آزاد اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ جہاں تک انشائیہ کا تعلق ہے "نیرنگ خیال" کے مضامین انشائیہ کے مروجہ تصور کے مطابق اسی حد تک انشائیہ کہے جا سکتے ہیں کہ یہ تخلیقی تازگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کسی حد تک موضوع کو نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ مگر چونکہ ان مضامین میں عدم تکمیل کے بجائے تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ اور آزادہ روی کے بجائے کہانی کا سا ربط و تسلسل ہے اس لئے انہیں جدید انشائیہ کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب میں انگریزی کی تقلید میں مضمون نگاری کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور اس ضمن میں سر سید احمد خاں کی کوشش کو بڑا دخل ہے۔ سر سید اور ان کے رفقاء نے "تہذیب الاخلاق" میں مختلف النوع

لے "نیرنگ خیال" ۔ محمد حسین آزاد ص ۶۸-۶۹

مضامین ومقالات لکھ کر اردو ان ادیبوں کو ایک نئے ذریعۂ اظہار سے روشناس کرایا
مگر چونکہ یہ دور اصلاحی دور تھا، اور سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کے پیش نظر مسلمانوں کی
اصلاحِ احوال کا واضح مقصد تھا۔ اس لئے وہ خاص انشائیہ کی طرف توجہ نہ دے سکے۔
پھر بھی سرسید احمد خاں کے بعض مضامین مثلاً "گزرا ہوا زمانہ" "امید کی خوشی" "انسان کے
خیالات" "امید" اور کسی حد تک "کاہلی" "خوشامد" اور "بحث وتکرار" میں جزدی طور پر انشائیہ کا
انداز جھلکتا ہے۔ کیونکہ یہ مضامین بنیادی طور پر انگریزی انشائیہ کی تقلید ہی میں لکھے گئے
اگرچہ یہ انشائیہ نما مضامین انشائیہ کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے، تاہم انہیں اردو انشائیہ کے
اولین خام نمونوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء
کے سامنے انشائیے کا موجودہ معیار نہ تھا۔ ہمارے زمانے میں انشائیے کی
جو صورت متشکل ہوئی ہے اس وقت اس کا شعور ممکن ہی نہ تھا۔ لہٰذا سرسید اور ان کے
رفقاء کے مضامین کو انشائیہ کے موجودہ تصوّر و معیار کے مطابق پرکھنے کے بجائے اس
دور کے مجموعی رویے کے تناظر میں دیکھنا چاہیے:

سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کا تعلق انیسویں صدی کے نصف آخر سے
ہے۔ اسی زمانہ میں "اودھ پنچ" کے اجرا سے اردو ادب میں طنز و مزاح
کی روایت ایک تحریک کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اودھ پنچ کا مقصد
بھی اگرچہ معاشرے کی اصلاح تھا۔ مگر سرسید کے برعکس "اودھ پنچ"
کے لکھنے والے انگریزی تعلیم و تمدن کے بجائے مشرق کی درخشندہ روایات
کا احیاء چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے "اودھ پنچ" کے صفحات پر سرسید احمد خاں کے
نظریات و خیالات پر کڑی تنقید کی جاتی رہی ہے۔ اگلے باب میں "اودھ پنچ"
کے قلمکاروں کی نثری تخلیقات کا جائزہ لے کر ان میں انشائیہ کا سراغ
لگانے کی کوشش کی جائے گی۔

چوتھا باب

انشائیہ اور طنز و مزاح کا پہلا دور

طنز و مزاح کی تعریف اور ماہیّت چونکہ اس مقالہ کے موضوع سے خارج ہے اس لئے طنز و مزاح کی تفصیلی تعریف سے گریز کیا جاتا ہے تاہم طنز و مزاح کے بارے میں مختلف نقادوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ طنز اور مزاح ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ طنز نگار معاشرے کی ناہمواریوں کو نشانۂ طنز بنا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے اور مزاح نگار انہی ناہمواریوں سے محظوظ ہوتا اور ان سے اکتسابِ مسرت کرتا ہے۔ طنز نگار تضادات کو اس طرح نمایاں کرتا ہے کہ ان کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ جبکہ مزاح نگار عموماً ان تضادات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری ان کے بے ڈھنگے پن پر بے ساختہ مسکرا اٹھتا ہے۔ لیکن مزاح نگار کی کامیابی اس میں ہے کہ قاری محض ہنسنے اور قہقہہ لگانے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ہنسنے کے بعد لحظہ بھر رک کر غور و فکر بھی کرے۔ یوں دیکھئے تو بظاہر طنز نگار اور مزاح نگار کے مقصد میں بیّن اختلاف موجود ہے۔ مگر چونکہ براہ راست طنز کی چبھن عموماً ناقابلِ برداشت ہوتی ہے اس لئے طنز نگار بھی طنز کی کڑوی گولی کو مزاح کی شکر میں لپیٹ کر پیش کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ بھی انہیں حربوں سے کام

Scanned by CamScanner

لیتا ہے جس سے مزاح نگار مزاح پیدا کرتا ہے یہاں آکر طنز و مزاح نگار کی دوئی مٹ جاتی ہے۔

مزاح پیدا کرنے کے لئے عموماً موازنہ، رعائت لفظی، تحریف، رمز، مزاحیہ صورتِ واقعہ اور مزاحیہ کردار وغیرہ سے مدد لی جاتی ہے۔ موازنہ کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزوں میں ایسی مشابہت تلاش کی جائے جو تضاد اور ناہمواری کو اس طرح پیش کرے کہ قاری بے ساختہ ہنس پڑے۔ مثلاً شیخ سعدی سے لے کر شیخ چلی تک تمام مفکرین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ فقرے میں شیخ سعدی اور شیخ چلی میں جو مشابہت اور تضاد ہے وہ قاری کے لئے سامانِ تفریح پیدا کرتا ہے۔ رعائت لفظی بھی حقیقت میں موازنہ ہی کی ایک صورت ہے۔ رعائت لفظی کے تحت الفاظ کا تلفظ تبدیل کرنے اور دوسری زبانوں کے الفاظ کی پیوند کاری کے علاوہ ایسے ذومعنی الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے جو بیک وقت مشابہت اور تضاد کی طرف اشارہ کریں اس قسم کے مزاح کو بذلہ سنجی (WIT) کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ مرزا غالب کا یہ فقرہ رعائت لفظی سے مزاح پیدا کرنے کی ایک اچھی مثال ہے۔

"میاں تمہارے دادا امین الدین خان بہادر ہیں۔ میں تو تمہارا دلدادہ ہوں۔"

تحریف کسی مشہور تصنیف کی مضحک نقالی کا نام ہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت کی تحریف "پنجاب کا جغرافیہ"، کا یہ اقتباس تحریف کے مفہوم کو سمجھنے میں معاون ہو سکتا ہے۔

"دریائے ظفر علی خاں پنجاب کا سب سے بڑا دریا ہے جو ہمیشہ اپنا راستہ بدلتا رہتا ہے۔ کسی زمانے میں اس دریا کی ہولناک موجیں ایک طرف سدِ سکندری سے جا ٹکراتی تھیں اور دوسری طرف قادیان کے ٹیلوں تک جا پہنچتی تھیں لیکن اب اتحادی انجنیروں نے اس کے دونوں کناروں پر مضبوط بند باندھ دیا ہے۔ اور اس پر واہ کے سیمنٹ سے ایک عظیم الشان پل تعمیر کر دیا ہے"۔ [1]

رمز بھی طنز و مزاح نگار کا ایک بڑا حربہ ہے۔ رمز کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کی تنقیص مقصود ہو اس کی اس طرح تعریف کی جائے کہ اس کی خامیاں خود بخود اجاگر ہو جائیں۔ رمز کی مثال کے لئے نواب سید محمد آزاد کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں بظاہر مغربی تہذیب کی تعریف کی گئی ہے لیکن در پردہ اس پر طنز مقصود ہے۔

"جب کسی کی میم کو کسی دوسرے صاحب کے ساتھ بے تکلفانہ ناچتے کودتے دیکھتا ہوں تو تمہاری شرم ایک تیر کی طرح دل کے پار ہو جاتی ہے جب کسی معزز لیڈی کو بیف کے ٹکڑے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو تمہارا چپاتیوں کو حنائی انگلیوں سے کھٹکنا یاد آتا ہے اور کیا جی گھبراتا ہے...... جب ایک روشن دماغ عورت کو دیکھتا ہوں کہ اپنی گفتار، رفتار اور ذہانت اور جودت سے بیس بیس جنٹلمین یعنی شریف مردوں کو خوش کرتی ہے تو اس وقت اس کا تاسف ہوتا ہے کہ

---

[1] جدید جغرافیہ پنجاب۔ سندباد جہازی۔ اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۴۶ء صـ ۳۹

تم تو ہرے عزیز مردوں کو دیکھ کر اس طرح سے مرجھا جاتی تھیں۔
جس طرح لجالو"[1]

خیال اور واقعہ کی نامطابقت سے مزاح پیدا کرنا فنی طور پر سب سے عمدہ خیال کیا جاتا ہے۔ واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کے لئے مزاحیہ صورتِ واقعہ کی تعبیر اس طرح کی جاتی ہے کہ قاری کے جذبۂ ترحم کو تحریک نہ ہو ورنہ جذبۂ ترحم ہنسی پر غالب آجائے گا اور مزاح پیدا نہیں ہو گا۔ مثلاً اگر ایک بنا ٹھنا شخص ایک خاص اکڑ اور تمکنت سے خراماں خراماں چلا جا رہا ہو اور معاً اس کا پیر پھسل جائے اور وہ گر پڑے مگر دوسرے ہی لمحے کھسیانا ہو کر کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہو تو دیکھنے والے بے اختیار ہنس پڑیں گے لیکن اگر اسے گرنے سے چوٹ آجائے یا وہ زخمی ہو جائے تو دیکھنے والوں کا جذبۂ ترحم بیدار ہو جائے گا اور مزاح پیدا نہیں ہو گا۔

مندرجہ بالا تصریحات طنز و مزاح نگاری کے حربوں سے متعلق ہیں۔ جہاں تک طنز و مزاح کی حیثیت کا تعلق ہے بقول نظیر صدیقی طنز و مزاح اصناف ادب نہیں بلکہ اوصافِ ادب ہیں اور یہ اوصاف ادب کی جملہ اصنافِ نظم و نثر میں موجود ہو سکتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی۔ سجاد حسین اور شفیق الرحمٰن وغیرہ اوصافِ ادب کے لحاظ سے مزاح نگار ہیں لیکن اصناف کے حوالے سے انہیں شاعر، ناول نگار اور افسانہ نگار کہا جائے گا۔

انشائیہ میں بھی طنز و مزاح کے اوصاف سے کام لیا جا سکتا ہے تاہم انشائیہ کو طنزیہ یا مزاحیہ مضمون کے مترادف نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ طنزیہ

---

[1] خیالات آزاد از نواب سید محمد آزاد مرتبہ غلام حسین ذوالفقار۔ مکتبہ خیابانِ ادب لاہور سوم ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۱

اور مزاحیہ مضمون میں طنز اور مزاح ناگزیر ہے۔ جب کہ انشائیہ میں طنز و مزاح کا ہونا ضروری نہیں۔ اگر انشائیہ کے لئے طنز و مزاح کو لازمی قرار دے دیا جائے تو انشائیہ اور طنزیہ و مزاحیہ مضمون میں عملاً کوئی حدِ فاصل نہیں رہے گی۔ چنانچہ ڈاکٹر سید محمد حسنین کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ مزاح انشائیہ کا لازمی عنصر ہے۔ ڈاکٹر حسنین کا کہنا ہے۔

"مزاح کو ذاتی طور پر میں انشائیہ کا جوہر ہی نہیں جوہرِ اعظم قرار دیتا ہوں۔ یہ انشائیہ نگاری کی سیرت و سرشت کا خمیر ہے اور یہی اس کے فن کا جلوۂ صد رنگ بھی ہے۔ انشائیہ میں مزاح کی دو قسمیں ہیں۔ ظرافت اور ہجو یعنی Humour and Satire یہ انشائیہ کے دو شوخ اور شایاں رنگ ہیں۔[1]

ڈاکٹر سید محمد حسنین کا یہ اقتباس اس بات کا غماز ہے کہ وہ انشائیہ کو طنزیہ و مزاحیہ مضمون ہی کی ایک کڑی سمجھتے ہیں۔ تبھی تو وہ مزاح کو انشائیہ کا جوہرِ اعظم قرار دیتے ہیں اور انشائیہ نگار کو واعظ اور ناصح کا مقام عطا کرتے ہیں۔ حالانکہ انشائیہ کے لئے نہ مزاح ضروری ہے اور نہ انشائیہ نگار واعظ اور ناصح کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ انشائیہ نگار تو اپنے اور اپنے قارئین کے درمیان بے تکلف اور دوستانہ فضا تخلیق کرتا اور انہیں اپنے نادر تجربات میں شریک کرتا ہے۔ وہ نہ انہیں ہنسانے کی کوشش کرتا ہے اور نہ کسی قسم کی نصیحت کرتا ہے۔ یہ انشائیہ کی اسی غلط توضیح کا نتیجہ ہے کہ ڈاکٹر حسنین نے انشائیہ کے نام پر اپنی کتاب میں طنز و مزاح کے نمونے یکجا کر دیئے ہیں انکے مقابلے میں نظیر صدیقی کا موقف قدرے بہتر ہے کہ وہ طنز و مزاح

---

[1] صنفِ انشائیہ اور انشائیے۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین ص ۲۹

کو انشائیہ کی خوبی قرار دیتے ہوئے بھی انشائیہ کے لئے طنز و مزاح کو ضروری نہیں سمجھتے۔

بہرحال اس بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ انشائیہ میں بعض اوقات طنز و مزاح کے عناصر بھی ابھر سکتے ہیں کہ طنز و مزاح انشائیہ کے لئے ممنوع نہیں۔ لہٰذا اس بات کا امکان موجود ہے کہ انگریزی ایسے کی تقلید میں جو طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے جاتے رہے ہیں ان میں سے بعض میں انشائیہ کا انداز بھی موجود ہو اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے کہ ان میں کس حد تک انشائیہ کی خصوصیات موجود ہیں۔ مضامین کی تخصیص اس لئے کہ افسانہ، ناول، ڈرامہ اور خاکہ وغیرہ کے مقابلے میں مضمون کی صنف میں انشائیہ کا موجود ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ مگر اس سے پیشتر کہ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا انشائیہ کی تعریف کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے اردو نثر میں طنز و مزاح کے آغاز و ترویج کے بارے میں مختصراً چند بنیادی باتوں کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔

○

اردو نثر میں طنز و مزاح کا باقاعدہ آغاز اگرچہ "اودھ پنچ" کے اجراء سے سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اردو نثر میں مزاح اور ظرافت کے اولین معیاری نمونے خطوطِ غالب میں پائے جاتے ہیں۔ جس طرح غالب جدید اردو نثر کے پیش رووں میں شمار ہوتے ہیں اسی طرح نثر میں معیاری ظرافت کی داغ بیل بھی انہی نے ڈالی۔ غالب کا مزاح جتنا برجستہ اور بے تکلف ہے اس کی مثال اردو نثر میں دور دور تک نظر نہیں آتی۔ دراصل شوخی و ظرافت غالب کی فطرت میں شامل تھی۔ ان کی اسی خصوصیت کے پیشِ نظر حالی نے

انہیں "حیوانِ ظریف" کا خطاب دیا تھا۔ غالب کی شوخی و ظرافت کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ کسی موقع و محل پر مدھم نہیں پڑتا۔ مرزا حاتم علی مہر کے نام لکھتے ہیں:

"آپ کا غم افزا نامہ پہنچا۔ میں نے پڑھا۔ یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوایا۔ انھوں نے جو میرے سامنے اس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا۔ یعنی اس کی اطاعت اور تمہاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا۔

سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہووے۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری، بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے باآں کہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے بیگانۂ محض ہو گیا۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامہ سازئ عشقِ مجازی چھوڑو"[۱]

---

[۱] ۔ عودِ ہندی ۔ مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل ۔ مجلس ترقئ ادب ۔ لاہور اول ۱۹۶۷ء، ص ۲۹۶۔۲۹۷

Scanned by CamScanner

غالب کی یہ شوخی اور ظرافت اردو نثر میں اپنی مثال آپ ہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہیں کہ اردو نثر میں شوخی و ظرافت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا علمبردار غالب ہے۔ اردو نثر میں طنز و مزاح کے پیش رو غالب کے خطوط اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر انشائیہ سے بھی قریبی مماثلت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان خطوط کا اسلوب بے حد شگفتہ، تازہ اور ادبیت کا حامل ہے بے تکلفی اور سادگی بھی ان خطوط کی خصوصیت ہے ان خطوط میں شخصی زاویۂ نگاہ بھی موجود ہے۔ اور کہیں کہیں وہ تیکھا پن بھی پایا جاتا ہے جو انشائیہ کی خاص خوبی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان خطوط کو انشائیہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ بہرحال خطوط ہیں۔ اگر انہیں انشائیہ کہا جائے تو پھر ان کو افسانہ۔ ڈرامہ، رپورتاژ، آپ بیتی سبھی کچھ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان خطوط میں افسانوی انداز بھی موجود ہے۔ اور ڈرامائی عنصر بھی۔ رپورتاژ کا رنگ بھی ان میں پایا جاتا ہے اور آپ بیتی تو یہ ہیں ہی۔ خطوطِ غالب اول و آخر خطوط ہیں۔ اور انہیں انشائیہ کہنے کا کوئی جواز نہیں۔ طنز و مزاح کے ضمن میں غالب کی اہمیت کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ طنز و مزاح اصنافِ ادب نہیں بلکہ اوصافِ ادب ہیں اور یہ وصف ادب کی تمام اصناف میں نمایاں ہو سکتا ہے۔ پھر بھی اس حقیقت کے باوجود کہ غالب اردو نثر میں طنز و مزاح کے پیش رو ہیں۔ طنز و مزاح کے ضمن میں اصل اہمیت "اودھ پنچ" ہی کو حاصل ہے۔ کیونکہ اس اخبار کے لکھنے والوں نے ہی پہلے پہل طنز و مزاح کی خصوصیات کو ایک غالب رجحان کے طور پر اپنی تحریروں میں استعمال کیا اور ان اوصاف سے معاشرتی اور سیاسی اصلاح کا کام لیا۔ انہی کی بدولت طنز و مزاح نگاری نے انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف سفر کیا ورنہ اس سے پہلے طنز شخصی ہجویات تک محدود تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی مسلّم ہے

Scanned by CamScanner

کہ "اودھ پنچ" کی ظرافت کا معیار انتہائی پست تھا۔ "اودھ پنچ" کے قلمکاروں کے نزدیک مزاح کا مفہوم پھکڑپن اور طنز کا مطلب دشنام طرازی، پھبتی اور گالی گلوچ تھا۔ پھر چونکہ اودھ پنچ کی طنز و مزاح نگاری کا انحصار جملہ بازی اور ضلع جگت پر تھا۔ اس لئے اس روش سے طنز و مزاح میں ایک ایسا عامیانہ پن پیدا ہو گیا جس نے ایک طویل مدت تک طنز و مزاح کو تہذیب و شائستگی کے دائرے سے باہر رکھا۔ اودھ پنچ کے اجراء سے طنز و مزاح کی جو روایت پروان چڑھی وہ بازاری اور عوامی حیثیت رکھتی ہے۔ بقول چکبستؔ ——

"جو پھبتی اس میں نکل جاتی تھی وہ مہینوں زبان پر رہتی تھی اور دور دور مشہور ہو جاتی تھی"۔

"اودھ پنچ" کے نثر نگاروں میں اودھ پنچ کے مدیر منشی سجاد حسین کے علاوہ نواب سید محمد آزادؔ، مرزا مچھو بیگ ستم ظریفؔ، تربھون ناتھ ہجرؔ جوالا پرشاد برقؔ اور احمد علی شوقؔ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

منشی سجاد حسین کا نام اودھ پنچ کے نثر نگاروں میں سر فہرست ہے۔ انہوں نے اپنے دور کی سیاست اور معاشرت دونوں کو نشانۂ طنز بنایا انہوں نے انگریز اور مقامی حکمرانوں کے نام اپنے کھلے خطوط میں سیاسی مسائل پر جس انداز سے تبصرہ کیا ہے اس سے ان کی بیباکی۔ صاف گوئی اور خلوص کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گلیڈٹن کے نام ایک کھلے خط میں لکھتے ہیں۔

"میں نے تمہاری فارن پالیسی کبھی لائقِ ستائش نہیں پائی۔ رفاہ و فلاح آرائش و زیبائش۔ ظاہری ٹم ٹام۔ اوپری لیس پوت کے واسطے تمہاری ذات مخصوص ہے۔ مگر اس کے لوازم اور مصالحوں کی فراہمی اور ترکیب سے تم ایسے محروم جیسے ہندوستانی جودت سے۔ تم پولٹیکل دسترخوان کے

اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمت گار ہو۔ پکا پکایا کھانا۔ تیار ہانڈی تم خوبی سے چن سکتے ہو۔ مگر ہانڈی پکانے اور چیز تیار کرنے کے نام سے خاک دھول بکائن کے پھول [1]

چونکہ منشی سجاد حسین کا جھکاؤ کانگریس کی طرف تھا اس لئے انہوں نے مسلم لیگ کو بھی نشانۂ طنز بنایا۔ اسی ضمن میں ان کا مضمون "انڈے بچے والی چیل چلہار" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ عمومی طور پر منشی سجاد حسین کی تحریروں میں مزاح سے زیادہ طنز کی کارفرمائی ہے۔ جو بعض اوقات دشنام طرازی کی حد تک جا پہنچتی ہے۔ تاہم ان کی طنز عموماً سطحی نوعیت کی ہوتی ہے۔

اودھ پنچ کے صفحات پر ابھرنے والے نثر نگاروں میں سید محمد آزاد کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ سید محمد آزاد اگرچہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے اور تہذیب مغرب کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن ایک طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے مشرقی تہذیب کی ناہمواریاں بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہ تھیں مشرقی تہذیب کی ناہمواریاں "نوابی دربار" میں اجاگر کی گئی ہیں جسے اردو کا پہلا نثری ڈرامہ ہونے کا امتیاز بھی حاصل ہے اور مغربی تہذیب پر ان مضامین میں طنز کی گئی ہے جو اودھ پنچ میں "نامہ و پیام" کے زیرِ عنوان شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ خطوط ایک مغرب زدہ ہندوستانی کی طرف سے، بیوی، باپ اور دوست کے نام لندن سے لکھے گئے ہیں۔ انداز ایسا ہے کہ بظاہر مغربی تہذیب کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ مگر بین السطور طنز کی جراحت صاف محسوس ہوتی ہے۔

نواب آزاد نے "نئی روشنی کی ڈکشنری" کے عنوان سے مغربی تہذیب پر جو

---

[1] گلدستۂ پنچ۔ مرتبہ کشن پرشاد کول — ہندوستانی پریس۔ لکھنؤ۔ اول ۱۹۱۵ء ص ۴

Scanned by CamScanner

نکتہ چینی کی ہے وہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ انہوں نے الفاظ کو جو نئے مفاہیم عطا کئے ہیں وہ ان کے ذہنِ رسا کے غماز ہیں۔ ایک دو مختصر اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"پارلیمنٹ (جلسۂ مدبرانِ ملکی)۔ مدبروں کا آشیانہ۔ فصحا اور بلغا کی پرورش کا زچہ خانہ، کسی ملک کے قابل لوگوں کی قوت گویائی کے تماشے دکھانے کا تھیٹر۔ وہ پالی جہاں کا اسپیل اور ٹینی دونوں کٹر۔ زبانی لڑائی کا میدان۔ خیالی پلاؤ بیچنے والے کی دوکان۔ باہمی نفاق اور ذاتی رشک وحسد کا تنور۔ خیالی اور لسانی کشتی کا مہذب اکھاڑہ .... الخ[1]"

"مہذب بی بی۔ جس کی ہر بات میں میاں کی نجات اور جو کہ ان کے لئے تمام عالم میں سب سے بڑھ کر بکار آمد اور تشفی بخش دستاویز ہے۔ مرضِ بداقبالی اور ناقابلیت کی صحت کا وہ چلتا ہوا نسخہ جس میں کبھی خطا نہیں۔ رسائی اور ترقی کا وہ طلسمی کفایت آموز انجن جس میں آگ نہیں پانی نہیں، ہوا نہیں۔ وہ تریاق جو اپنی اثر فشانیوں سے اپنے شوہر کی سم آلود اور ظلم انگیز حکمتِ عملی کے شیون خیز اور ماتم ریز ضرروں کا آسانی سے ازالہ کر دے۔"[2]

یہی نہیں کہ آزاد صرف مغربی تہذیب ہی کو نشانۂ طنز بناتے رہے ان کی باریک بین نظریں اپنے معاشرے کی ان قباحتوں سے بھی ناواقف نہ تھیں جو پرانی تہذیب کی دین تھیں، چنانچہ انہوں نے مشرقی تہذیب کی بعض کمزوریوں

۱۔ خیالاتِ آزاد مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صہ ۱۵-۱۶

۲۔ ایضاً صہ ۲۲

کو نمایاں کرنے کے لئے "چودھویں صدی کی پرانی ڈکشنری" اور "پرانی روشنی کی نئی ڈکشنری" کے عنوانات استعمال کئے ہیں۔ پرانی روشنی کی ڈکشنری بھی دیکھتے چلئے۔

"میاں جی (بد قرینیہ) وہ بلائے بے درماں جو چند صدی سے ہمارے ملک کے معصوم لڑکوں پر بے طرح نازل ہے۔ . . . . . وہ اتالیق جس کی صحبت پر منفعت میں لڑکوں کو علاوہ اور فوائد کثیرہ کے حقہ برداری بھی آجائے۔ وہ زبردست ٹیچر (سبق آموز) جو صرف اپنی قوت بازو سے شاگردوں کو سبق یاد دلائے۔ وہ باکمال استاد جو علم کی تلخ گولی کو اکثر گالی کے ساتھ گھول کر پلائے۔ ہر بات کے نزمانے پر لڑکوں کو دو ایک لات اور پانچ سات چپت لگا دینے والا۔" [1]

نئی اور پرانی ڈکشنری آزاد کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو اردو طنز و مزاح میں یقیناً نئی چیز ہے۔ انہوں نے مختلف الفاظ کو جو معنی پہنائے اور جس طرح ان کی تشریح کی ان میں سے بیشتر آج کے ماحول پر بھی صادق آتے ہیں۔ مثلاً میاں جی یعنی اسکول ماسٹر کی جو تصویر انہوں نے کھینچی ہے وہ ہمارے آج کے سرکاری سکولوں (خصوصاً دیہاتی سکولوں) کے پرائمری کے استادوں پر بھی صادق آتی ہے۔ اپنے دور میں بھی یہ ڈکشنری دلچسپی سے پڑھی گئی۔ عبدالغفور شہباز خیالاتِ آزاد کے دیباچہ میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سب سے پہلے ڈکشنری کی ایجاد کی۔ اس رنگ نے وہ عام مقبولیت حاصل کی کہ اس وقت کے کل رنگ پھیکے پڑ گئے۔" [2]

---

[1] خیالاتِ آزاد صہ ۵۷-۵۸

[2] ایضاً دیباچہ صہ ۳

Scanned by CamScanner

مجموعی طور پر نواب آزاد کی طنز میں جو گہرائی اور کاٹ ہے وہ اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں سے کسی اور کے حصے میں نہیں آئی - ان کی تحریر میں جو سلاست، روانی اور بے ساختگی ہے وہ بھی انہیں اپنے ہم عصر لکھنے والوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اور رمز کا استعمال جس خوبی سے انہوں نے کیا وہ انہی کا حصہ ہے - اپنی ان خوبیوں کی بنا پر وہ اودھ پنچ کے قلمکاروں میں ممتاز اور منفرد مقام کے مالک ہیں۔

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف شاعر بھی تھے لیکن ان کی شہرت ان کی نثری تحریروں ہی کی مرہونِ منت ہے - ان کی تحریروں میں طنز کی وہ شدت نہیں جو منشی سجاد حسین سے مخصوص ہے - اس کے برعکس ان کی تحریروں میں مزاح کا رنگ نسبتاً شوخ ہے - بقول چکبست "طبیعت کے چلبلے پن اور شوخی کے لحاظ سے اور نیز زبان کی پختگی اور لکھنؤ کی بول چال اور محاورہ کی صفائی کے اعتبار سے ستم ظریف کا رنگ اوروں کے مقابلے میں چوکھا ہے" [۱]

تربھون ناتھ ہجر نے سیاست سے زیادہ معاشرتی قباحتوں کو ہدف بنایا اور مذہبی رسوم کی آڑ میں پروان چڑھنے والی فحاشی کی نشاندہی کامیابی سے کی بجرم الطرام کے عنوان سے لکھے گئے ایک مضمون کی چند سطریں بات کی وضاحت کے لئے کافی ہوں گی -

"صبح ہوتے تعزیوں کی سیریں دیکھیں - رانگے کی ضریح میاں خدا بخش کی بنائی ہوئی اس آن بان سے نکلی کہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ چاندی کی ضریح ڈھال کے تیار کی گئی ہے - کاظمین اور تال کٹورے کے جگمگے

---

[۱] گلدستۂ پنچ صہ ۶

بھی مدتوں یاد رہیں گے۔ بڑے بڑے نواب اور اونچی اونچی رنڈیاں ننگے سر برہنہ پا اسی دن دیکھنے میں آئیں۔ حضرت! رنج والم کا تو نام ہی نام تھا۔ یار لوگوں کے اندھیرے اجالے مطلب برآری خوب ہوئی۔"[1]

منشی جوالا پرشاد برق کی شہرت معشوقۂ فرنگ (ترجمہ رومیو جولیٹ) کی رہونِ منت ہے۔ اودھ پنچ میں سیاسی مسائل پر انہوں نے جو مضامین لکھے ان میں طنز و مزاح کی بجائے سنجیدگی اور غور و فکر کا رنگ نمایاں ہے۔

احمد علی شوق بھی معاشرتی اور تہذیبی قباحتوں کے نقاد تھے۔ ان کا ایک مضمون عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پوچھا چاہیئے۔ پھکڑ پن اور عامیانہ رنگ میں رنگا ہونے کے باوجود اپنے دور کے اوباش طبقے کی مؤثر تصویر پیش کرتا ہے۔

مجموعی طور پر "اودھ پنچ" کے قلمکاروں نے مزاح سے زیادہ طنز و جراحت کی روایت کو پروان چڑھایا اور صرف انگریزی تعلیم و تہذیب ہی کو ہدفِ طنز نہیں بنایا بلکہ بعض شخصیات پر بھی کیچڑ اچھالا۔ حالی۔ سرشار۔ داغ اور شرر کی تذلیل اور اہانت کو جس طرح روا رکھا گیا۔ اس کی تفصیلات ڈھکی چھپی نہیں۔ جہاں تک اودھ پنچ کی طنز و ظرافت کے فنی اور ادبی مقام کا تعلق ہے اس کی اساس مبالغہ آمیز جملہ بازی اور ایسی رعایت لفظی پر رکھی گئی ہے جسے اعلیٰ درجے کی ظرافت کہنے میں تامل ہوتا ہے۔ تاہم اودھ پنچ کے قلمکاروں کا یہ کارنامہ اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے طنز و مزاح کو باقاعدہ روایت کی شکل دی اور اس سے اجتماعی مسائل و معاملات میں اصلاح کا کام لیا۔ اس دور

[1] گلدستۂ پنچ صہ ۹۶

کے لکھنوی معاشرے میں جو خامیاں اور کمزوریاں گھر کر گئی تھیں" اودھ پنچ" کے لکھنے والوں نے انتہائی بے رحمی سے ان کا پوسٹ مارٹم کیا۔ محرم اور چہلم کی آڑ میں ہونے والی فحاشی، عیش باغ کے جمگھٹے، مرغ بازی اور بٹیر بازی کے نام پر ہونے والا جوا، کوئی چیز بھی " اودھ پنچ "کے قلمکاروں کی نظر سے پوشیدہ نہ تھی۔ ملکی سیاست پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ اور ایک ذمہ دار صحافی کی حیثیت سے سجاد حسین اور ان کے رفقاء اپنے نقطۂ نظر کے مطابق سیاسی امور پر تبصرہ و تنقید کرتے رہتے تھے۔ چونکہ اودھ پنچ کے لکھنے والوں کے سامنے ایک واضح مقصد تھا اس لئے ان کے ہاں بات کو براہِ راست انداز میں پیش کرنے کا رجحان بھی غالب نظر آتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر تحریروں میں زہرناکی سطح پر تیرتی نظر آتی ہے جو ادبی لحاظ سے ان تحریروں کے مقام و مرتبہ کو نقصان پہنچاتی ہے۔ یہی وجہ ہے" اودھ پنچ" کی بیشتر تحریروں کی ادبی سطح پست ہے اور چونکہ ان میں طنز و مزاح مقصود بالذات ہے جو انشائیہ کی روح کے منافی ہے اس لئے ان میں انشائیہ کی تلاش سعیٔ لاحاصل ہے۔

" اودھ پنچ "کے قلمکاروں کا ذکر ختم کرنے سے پہلے پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ذکر لازمی ہے۔ سرشار ابتدا میں" اودھ پنچ " ہی سے منسلک تھے مگر بعد ازاں اودھ اخبار میں چلے گئے اور غالباً اسی لیے معتوب بھی ٹھہرے۔ فسانۂ آزاد جو اپنے مزاحیہ کردار خوجی کی وجہ سے زندۂ جاوید ہے اسی اخبار میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ رتن ناتھ سرشار اس دور کے لکھنے والوں میں اس لحاظ سے ممتاز و منفرد ہیں کہ وہ طنز نگار سے زیادہ مزاح نگار ہیں۔ اگرچہ انہوں نے عملی مزاح سے زیادہ کام لیا اور جملہ بازی و ضلع جگت پر اپنے مزاح کی بنیاد رکھی۔ جس سے ان کے مزاح کی سطح پست ہو گئی۔ مگر یہ بھی کیا کم ہے کہ طنز نگاروں کی اس صف میں وہ مزاح

Scanned by CamScanner

کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔

ڈاکٹر احراز نقوی نے اپنے ایک مضمون میں سرشار کو بطور انشائیہ نگار پیش کرتے ہوئے ان کے دو مضامین کو بھی انشائیہ کے نام سے پیش کیا ہے۔ نقوی صاحب کہتے ہیں۔

"اردو ایسے نویسی پر کسی نقاد اور محقق نے اپنی بحث میں غالباً سرشار کا ذکر نہیں کیا اور یہی سبب ہے کہ اردو انشائیوں پر تمام انتخابات ہو چکے ہیں مگر سرشار کا کوئی بھی انشائیہ کسی بھی انتخاب میں نظر سے نہیں گزرا۔ دراصل اس کی وجہ یہی رہی کہ سرشار کے انشائیوں کو دریافت ہی نہیں کیا گیا۔ اور نہ اس تصور کو ہی روا رکھا گیا کہ سرشار انشائیہ نگار بھی ہو سکتے ہیں .... نقوش کے اس شمارے کے لئے میں نے چند نمونے سرشار کی تحریر سے انتخاب کر لئے ہیں۔ دو تنقیدی مضامین ہیں۔ پہلا شاعری کے متعلق ایک چھوٹا سا نزعی مضمون ہے۔ دوسرا نثری صنف پر یعنی ناول کے فن پر تنقید ہے اس مضمون کو سامنے رکھ کر ہم ان کی فنی بصیرت اور ان کے ناولی ادراک کا ایک ہلکا سا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تیسرا عشق کے عنوان پہ انشائیہ ہے جو ہلکے پھلکے انداز سے من کی موج میں بہہ کر لکھا ہے اور چوتھا مضمون "بنی نوع انسان" پر ہے جس میں اردو انشائیہ کا انداز اور ٹھاٹ نظر آتا ہے [۱]

ڈاکٹر احراز نقوی کے بقول "بنی نوع انسان" میں اردو انشائیہ کا

---

[۱] سرشار بحیثیت انشائیہ نگار۔ ڈاکٹر احراز نقوی۔ نقوش۔ لاہور جنوری ۱۹۶۶ء ص ۲۶۱-۲۶۳

Scanned by CamScanner

انداز اور ٹھاٹ نظر آتا ہے اور چونکہ یہ مختصر مضمون ہے اس لئے من و عن نقل کیا جاتا ہے تاکہ اہلِ نظر خود فیصلہ کر سکیں کہ یہ انشائیہ ہے۔ یا نہیں۔

"
یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہے
وگرنہ ماہ کو کب شب کمال رہتا ہے

حضرتِ انسان نے اپنے لئے اشرف المخلوقات کا خطاب فضیلت انتساب تجویز فرمایا ہے۔ دیدۂ انصاف وا کر کے دیکھئے تو یہ خالی اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بن بیٹھے بلکہ واقعی خلعت اشرف المخلوقات کو خالق کارساز نے ان کے قد پر راست کیا ہے۔ امنّا اللہ زمین پر رہنے والے اور آسمان کی خبر لائیں۔ شمس جیسے منور کرّے کی باتیں بتائیں۔ جس کو انسان بے خبر گی نگاہ دیکھ نہیں سکتا۔ قمر کے پہاڑوں کی بلندی دریافت کریں "دریائے ذخار کا بند کرنا ہوا مٹھی میں تھامنا ہے۔ آگ اور پانی کے ذریعہ سے ریل کا چلانا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ مگر عقل کے صدقے پتھر کو موم کر دکھایا۔ دنیا میں جتنی مخلوق ہیں سب ان کا لوہا مانتی ہیں۔ سب کو انہوں نے نیچا دکھایا۔ ایسی زبردست کہ سب کو زیر کیا۔ ان کے آگے کسی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ یہ مشتِ خاک کا پتلا ہے۔ غبارہ وہ ایجاد کیا کہ کائنات الجو کی ہوا کھانے لگے۔ جہاں پرندوں کے پر جلیں وہاں جانے لگے۔ جدھر جاؤ ان ہی کی دھوم ہے۔ جہاں دیکھو ان ہی کا سکہ بیٹھا ہے کوئی ملک، کوئی جزیرہ، کوئی سمندر، کوئی جنگل الغرض کوئی مقام ایسا نہیں جہاں یہ نہ پہنچے ہوں۔ اپنے قدوم میمنت لزوم سے جنگل کو گلزار اور بن کو فرخار بنا دیا۔ جہاں کتے بھی نہیں لوٹتے تھے وہاں وہ وہ صورتیں

نظر آتی ہیں کہ انسان عش عش کر جائے۔ انسان ہر قسم کی آب و ہوا کو برداشت
کر لیتا ہے۔ ہر قسم کی سرزمین میں بسر کرتا ہے۔ قریب قریب ہر قسم کی غذا
استعمال میں لاتا ہے۔ دریائے بنگال کے کناروں پر آفتاب عالم تاب
کی تمازت اس غضب کی ہوتی ہے کہ اسپرٹ شراب ابلنے لگتی ہے۔ وہاں
یہی انسان بہ آرام تمام زندگی بسر کرتے ہیں۔ گرمی کو اصلا نہیں مانتے برعکس
اس کے براعظم ایشیا کے گوشہ شمال و مشرق میں اس درجہ سردی ہوتی
ہے کہ پارہ تک جم جاتا ہے۔ لیکن یہ وہاں بھی چین سے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر بلی
کا یہ مقولہ ہمیں ازبس پسند ہے کہ تمام روئے زمین پر صرف انسان ہی اس
قسم کی ذی روح ہے جو برہنہ ہے مگر ہنر اور صنعت اور دستکاری کے زور
سے ہر طرح کی آب و ہوا کے لائق اپنے جسم کی حفاظت کے لئے کپڑا بنا لیتا
ہے۔ سردی کے لئے اس قدر گرم کپڑا تیار کرتا ہے کہ اس کے پہنتے ہی سردی
کی عقل بھی سرد ہو جائے۔ جو موسم گرما میں ایسی پوشاک پہنتا ہے کہ گرمی کی گرم
بازاری پر اوس پڑ جائے۔ بارش کے لئے موم جامہ ایسا ایجاد کیا ہے
کہ چاہے کیسا ہی موسلا دھار برسے بدن پر ایک بوند اثر نہ کرے۔ ان ہی
اسباب سے وہ ہر ملک میں اور ہر فصل میں رہ سکتا ہے۔ اگر اور جانوروں
کی طرح اس کے جسم پر اون یا کسی قسم کی پوشش ہوتی تو گرم ملکوں میں وبالِ
جان ہو جاتی۔

حکمانے بنی نوع انسان کو مختلف اقسام پر منقسم کیا ہے جن کے خط و خال
آنکھ اور بال کھوپڑی اور کھال میں فرق ہے۔ ڈاکٹر پرٹ چارڈ نے کل مخلوق
کو تین حصوں پر منقسم کیا ہے۔ اولاً میلنک یعنی سیاہ۔ وہ لوگ جن کے بالوں
کا رنگ سیاہ ہے۔ ثانیاً ذین تہس یعنی صبیح۔ وہ لوگ جن کے بال زرد یا سرخ

یا بھورے ہیں۔ ثالثاً ایساٹمینو یعنی سفید جن کے بال بالکل سفید ہیں اور آنکھیں سرخ۔ بلومن باچ صاحب نے اس بارہ میں خوب لکھا ہے اور اکثر عقلا نے ان کی رائے صائب سے اتفاق ہی کیا ہے۔ ان صاحب نے انسان کے پانچ فرقے تجویز کئے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک فرقے کی کھوپڑی مختلف طرز کی ہے۔ یعنی کاکیشن۔ منگولین۔ ایسٹوپک۔ امرکن ملے۔

(۱) **کاکیشن:** اس فرقہ کا سر قریب قریب گول ہوتا ہے۔ پیشانی نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی۔ بلکہ بدرجہ اوسط استخوان رخسار نکلے ہوئے نہیں ہوتے۔ دونوں جبڑوں میں آگے کے دانت بصورت عمود۔ چہرہ بیضاوی۔ ناک محراب دار۔ دہن چھوٹا۔ نیچے کا ہونٹ کسی قدر نکلا ہوا۔ زنخداں مدوّر۔ اس فرقہ کے لوگ ہر ایک رنگ کے ہوتے ہیں۔ اصلی رنگ ان کا سفید ہے مگر آب وہوا اور تمازتِ آفتاب وغیرہ وجوہ سے گندم گوں، سیاہ فام اور سرخ سفید بھی ہوجاتے ہیں۔ اہلِ اسیریا۔ اہلِ بابل۔ اہلِ میڈیا فارسی، یہودی، عرب، ترکی، تاتاری، افغان، ہندو، فرانسیسی، ڈچ، اہلِ یونان، جرمن، پروس، آسٹریا، کوہ قاف، اسی گروہ میں شامل ہیں۔ افریقہ میں جو لوگ بحر میڈی ٹریرئین کے قریب رہتے ہیں وہ اور مصری اور اہلِ ابی سینا فرقہ کاکیشن سے ہیں۔

(۲) **اہلِ منگولین:** ان کے سر قریب قریب مربع ہوتے ہیں۔ استخوان رخسار نکلے ہوئے۔ چہرہ چپکلا۔ آنکھیں دھنسی ہوئی۔ ناک چپٹی۔ اس فرقہ کے لوگ سرخ و سفید یعنی صبح نہیں ہوتے۔ بلکہ رنگ کسی قدر مائل بہ زردی ہوتا ہے۔ بال سیدھے کالے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ مگر بہت ہی کم۔ داڑھی سو میں سے دس کے ہوئی بھی تو بالکل ذرا سی۔ چینی، جاپانی، بھوٹیے، اہلِ لیپ لینڈ

تبت، منز، اسکوئی مو۔ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۳) اتھیوپک : سر ادھر ادھر دبا ہوتا ہے۔ پیشانی بہ شکل گیند۔ استخوانِ رخسار نکلے ہوئے نیچے کے جبڑے بڑے اور مضبوط، آنکھیں ابھری ہوئی، اوپر کا ہونٹ موٹا، رنگ بالکل سیاہ اور گھنگریلے بال۔ جنوب صحرائے اعظم اور ابی سینا، آسٹریلیا، تیونس، پتیا، نیوگنا، جزیرہ سلمان فنجی وغیرہ کے باشندے فرقہ تھیوپک سے متعلق ہیں۔

(۴) امرکن : یہ لوگ منگولین سے کسی قدر مشابہت رکھتے ہیں۔ استخوان رخسار محراب دار، کھوپڑی ہلکی، چہرہ چکلا، پیشانی تنگ، ناک کسی قدر چپٹی۔ رنگ سرخی مائل یا کسی قدر سیاہ، بال منگولین سے، داڑھی بالکل ندارد۔ امریکہ کے اصلی باشندے اسی گروہ سے ہیں۔

(۵) ملے : ان لوگوں کی پیشانی کچھ یوں ہی سی محرابدار ہوتی ہے۔ استخوان رخسار نکلے ہوئے، ناک موٹی اور چوڑی، رنگ گیہواں، بال سیاہ۔[1]"

یہ ہے وہ مضمون جس میں ڈاکٹر احتراز نقوی کو اردو انشائیہ کا انداز اور ٹھاٹ نظر آتا ہے۔ غالباً اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ ایک عام قسم کا مضمون ہے جو واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ تمہیدی ہے جس میں انسان کی فضیلت کے موضوع کو بطریق احسن بیان کیا گیا ہے۔ اس حصہ میں قافیہ تجنیس، رعائت لفظی اور تشبیہ وغیرہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ معلوماتی ہے جس میں انسانوں کی مختلف اقسام کے بارے میں معلومات مہیا کی گئی ہیں جبکہ انشائیہ کا مقصد معلومات کی فراہمی نہیں۔ انداز بیان میں بھی معروضیت

---

[1] نقوش۔ لاہور جنوری ۱۹۶۶ء ص ۲۶۷-۲۶۸

پائی جاتی ہے جبکہ انشائیہ میں موضوعیت اور داخلیت کو اہمیت حاصل ہوتی ہے
غالباً ڈاکٹر اعزاز نقوی نے انشائیہ کو مضمون کی متبادل اصطلاح تصور کرتے ہوئے
سرشار کے اس مضمون کو انشائیہ کہا ہے ورنہ اس مضمون کو انشائیہ سے دور کا بھی
واسطہ نہیں۔ سرشار کا دوسرا مضمون جو "عشق" کے نام سے ہے قدیم انشاپردازی
کا نمونہ ہے جس میں انشا کی خصوصیات غالب ہیں۔

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ "اودھ پنچ" کے قلمکار مع سرشار انشائیہ
نگاروں کی صف میں شامل نہیں کئے جا سکتے کیونکہ ان ادیبوں نے عموماً خارجی حالات اور
واقعات کو نشانۂ طنز بنایا ہے۔ چونکہ ان کی طنز واضح طور پہ اصلاحی مقاصد کے
تابع تھی۔ اس لئے اس میں زہرناکی کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ جو انشائیہ کی روح کے
منافی ہے۔ وہ خوش دلی اور شگفتگی جو انشائیہ سے مخصوص ہے ان ادیبوں کے
مضامین میں نظر نہیں آتی۔ ذاتی تجربات کا عکس بھی ان کی تحریروں میں بہت کم
جھلکتا ہے۔ لہٰذا انشائیہ کے تدریجی ارتقا میں "اودھ پنچ" کے قلمکاروں کا کوئی حصہ
نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے "اودھ پنچ" کے قلمکاروں نے مشرقی ادبیات میں
ہجو نگاری کی روایت کو ہی پیشِ نظر رکھا ہے اور انگریزی انشائیہ نگاروں سے
استفادہ نہیں کیا ورنہ اس وقت تک چارلس لیمب، ولیم ہیزلٹ، لی ہنٹ اور
گولڈ سمتھ ایسے انشائیہ نگار سامنے آ چکے تھے۔ دراصل جس طرح سر سید احمد خاں
نے انگریزی کے خالص انشائیہ نگاروں کے بجائے ایڈیسن اور اسٹیل کی اصلاح
پسندی کی روایت کو اپنایا بعینہٖ "اودھ پنچ" کے قلمکاروں نے "لندن پنچ" کو بطور
مثال سامنے رکھا اور "اودھ پنچ" سے وہی کام لینا چاہا جو "لندن پنچ" سے لیا جا
رہا تھا۔ مگر چونکہ "اودھ پنچ" کے قلمکاروں کی ذہنی تربیت فارسی اور اردو ہجویات
کے زیرِ اثر ہوئی تھی۔ اس لئے وہ مزاح کے معیاری نمونے پیش نہ کر سکے تاہم

وہ طنز کا رخ انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو گئے اور یہی ان کی عطا ہے۔

"اودھ پنچ" کے قلمکار سرسید احمد خاں کے لائحہ عمل سے مطمئن نہیں تھے یہی وجہ ہے انہوں نے سرسید کے افکار و خیالات کو نشانۂ طنز بنایا۔ سرسید نے سادہ نگاری کی جو تحریک شروع کی تھی کچھ لکھنے والے اس سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ اور اس تحریک کو اردو ادب کے لئے مفید نہیں سمجھتے تھے۔ محمد حسین آزاد کا رنگین اسلوب اس رجحان کا انفرادی ردِ عمل تھا۔ میر ناصر نے سرسید کے نظریات کے علاوہ ان کے اسلوب پر بھی نکتہ چینی کی اور آزاد کے اسلوب کو آگے بڑھایا۔ شرر نے بھی شاعرانہ نثر کو ذریعۂ اظہار بنا کر سادہ نویسی کی تحریک سے انحراف کیا۔ میر ناصر اور شرر کی شاعرانہ نثر سے اردو میں انشائے لطیف کی تحریک کا آغاز ہوا۔ آئندہ صفحات میں انشائے لطیف کے نام سے پیش کی گئی تخلیقات کا انشائیہ کے نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

Scanned by CamScanner

پانچواں باب

انشائیہ اور انشائے لطیف

انشائے لطیف یا ادبِ لطیف کا انشائیہ سے کیا تعلق ہے؟ اس مسئلہ پر غور کرنے سے قبل انشائے لطیف کی ماہیّت سے آگاہی ضروری ہے۔ اردو میں انشائے لطیف کی تحریک کو رومانی تحریک بھی کہا جاتا ہے۔ رومانی تحریک کا آغاز فرانسیسی ادب میں روسو سے منسوب ہے۔ فرانسیسی ادب سے یہ تحریک انگریزی ادب میں اور انگریزی ادب کی وساطت سے اردو میں پہنچی۔ تاہم بقول ڈاکٹر عبدالودود "اردو کی رومانی تحریک انگریزی ادب میں رومانیت کے علاوہ جمالیت کی تحریک سے بھی متاثر ہوئی" اس لئے انشائے لطیف کو رومانیت اور جمالیت دونوں تحریکوں کے پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ مزید برآں رومانیت اور جمالیت کو اس وقت تک سمجھنا مشکل ہے جب تک کلاسیک کی حدود تعریف پیشِ نظر نہ ہو۔ چونکہ کلاسیکیت رومانیت اور جمالیت اس مقالہ کے موضوع سے خارج ہیں اس لئے ان کی مختصر تعریف پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کلاسیک کے بارے میں مختلف نقادوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ کلاسیکی ادب میں مواد اور ہیئت میں توازن پایا جاتا ہے۔ یعنی نہ مواد کو ہیئت پر فوقیت دی جاتی ہے اور نہ ہیئت کو مواد پر ترجیح گویا نظم و ضبط اور اعتدال و توازن کلاسیکی ادب کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ مزید برآں

کلاسیکی رجحان کے حامل ادیب روایت کے پرستار ہوتے ہیں اور متقدمین کے قائم کردہ فنی سانچوں اور قواعد و ضوابط کی پیروی کرتے ہیں۔ یوں کلاسیکی ادب اجتماعیت کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ کلاسیکی ادب کے حامل ادیبوں کے برعکس رومانی ادیبوں کی سب سے بڑی خصوصیت جذبات اور تخیل کی پرستش کے ضمن میں ان کا غیر معتدل رویہ ہے۔ وہ اظہارِ جذبات کے راستے میں کسی قسم کی مزاحمت برداشت نہیں کرتے۔ یوں ان کے ہاں جذبہ بے لگام ہو کر نظم و ضبط اور اعتدال کھو بیٹھتا ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں مواد اور ہیئت کا وہ توازن برقرار نہیں رہتا جو کلاسیکی رجحان کے ادیبوں کی خصوصیت ہے۔ روایت سے بغاوت اور قدماً کے قائم کردہ اصولوں اور ضوابط سے انحراف رومانی ادیبوں کی ایک اور خصوصیت ہے یعنی رومانی ادیب انفرادیت پسند ہوتے ہیں اور حسن کے مظاہر سے لطف اندوز ہونا اپنا بنیادی حق سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے حسن اور حسنِ بیان کو رومانی ادیب بے حد اہمیت دیتے ہیں۔

رومانی تحریک کا آغاز فرانس میں ہوا۔ عام طور پر روسو کو اس تحریک کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی ادب میں اس تحریک کو فروغ دینے والوں میں پیٹر کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اس نے کلاسیکیت اور رومانیت کے اختلاف کو واضح کرنے کے لئے متعدد مضامین بھی لکھے۔ جیمس۔ لینگ۔ کالرج۔ شیلے کیٹس اور ورڈزورتھ کا شمار رومانی مصنفین میں کیا جاتا ہے۔ حسنِ فطرت کی تصویر کشی میں جو کامیابی اور شہرت ورڈزورتھ کو نصیب ہوئی وہ اسی سے مخصوص ہے۔

رومانی تحریک کے کچھ عرصہ بعد انگریزی ادب میں جمالیت کا آغاز ہوا۔ انگلینڈ میں جمالیت یعنی ادب برائے ادب کے ابتدا سوئن برن سے منسوب ہے۔ مگر اس ضمن میں اصل اہمیت آسکر وائلڈ کو حاصل ہے۔ آسکر وائلڈ

Scanned by CamScanner

ہی وہ ادیب ہے جس سے بیشتر لکھنے والوں نے اثر قبول کیا۔

اردو ادب میں رومانیت اور جمالیت کے اوّلین نقوش میر ناصر علی اور عبدالحلیم شرر کے مضامین میں نظر آتے ہیں۔ تاہم اردو میں رومانی تحریک کا باقاعدہ آغاز سجاد حیدر یلدرم کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح انگریزی ادب میں رومانیت اور جمالیت نے علیحدہ علیحدہ تحریکوں کی حیثیت حاصل کی اردو میں ایسا نہیں ہوا۔ اردو میں رومانیت اور جمالیت کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اردو کی رومانی تحریریں جمالیاتی پہلو بھی لئے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بیشتر تحریروں میں جمالیات ہی کو اولیت حاصل ہے اس لحاظ سے اردو کی رومانی تحریک بنیادی طور پر جمالیاتی تحریک ہی سے متعلق ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس تحریک کے لئے عموماً "انشائے لطیف" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ جس میں لطافت کو اہمیت حاصل ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالودود رومانیت اور جمالیت دو مختلف رجحانات ہیں۔ مگر اردو والوں نے ان دونوں کو باہم مربوط کرکے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

"ادبِ لطیف کے مصنفین کے خیالات میں دو عناصر نظر آتے ہیں۔ پہلا عنصر رومانی اور دوسرا جمالیاتی ہے۔ ان فنکاروں کے خیالات کا جب جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کے یہاں ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں جو ان کے ذہن کو رومانی ثابت کرتی ہیں۔ ہم ادبِ لطیف کو صرف رومانیت کے اثرات کا نتیجہ نہیں کہہ سکتے۔ ادبِ لطیف پر رومانیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن ادبِ لطیف رومانیت کے علاوہ اور بہت کچھ بھی ہے۔ اسے صرف رومانیت کہہ دینا ہی کافی نہیں۔ جن تحریروں کو ادبِ لطیف کا نام دیا جاتا ہے ان میں رومانیت اور جمالیت ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا

جا سکتا۔ انگریزی ادب میں جمالیت رومانیت کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔
اردو نثر میں یہ دونوں رجحانات الگ الگ دور کی حیثیت نہیں رکھتے مغربی
رومانی اور جمالیاتی ادب کے مطالعہ کا اثر اردو داں طبقہ پر یہ ہوا کہ ان دونوں
کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ ایسی نثر کو اظہارِ خیال
کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ جسے نثر میں شاعری کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے ——
—— ہم ادبِ لطیف کے مصنفین کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس
نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ادبِ لطیف، پر رومانیت کا اطلاق تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن
اس کی اہمیت صرف رومانی خیالات تک محدود نہیں۔ جمالیاتی احساس کے
بغیر ادبِ لطیف کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جمالیاتی احساس ہی تحریر کو رنگین
بنا دیتا ہے۔ بعض جگہ تو یہ رنگینی اس قدر زیادہ ہے کہ رومانی تصور پوشیدہ
ہو جاتا ہے"[1]

اردو ادب میں انشائے لطیف یا ادب لطیف سے مراد ایسی تحریریں ہیں
جو بیک وقت رومانی بھی ہیں اور جمالیاتی بھی۔ یعنی کلاسیکیت کے برعکس روایات
سے بغاوت اور انفرادیت و انانیت کی مظہر ہونے کے علاوہ ایسے اسلوبِ نگارش
کی حامل ہیں جسے شاعرانہ کہا جاتا ہے اور جو ان کے ذوقِ جمال کا نتیجہ ہے دراصل
اردو ادب میں ادبِ لطیف کا آغاز صرف انگریزی ادب کی جمالیاتی تحریک کے
تاثر کا نتیجہ ہی نہیں بلکہ سر سید احمد خاں کی اصلاحی تحریک کے ردِّ عمل کا نتیجہ بھی
بھی معلوم ہوتا ہے۔ سر سید احمد خاں نے اردو کی قدیم مرصّع و مُقفّیٰ نثر کو بیک جنبشِ
قلم مسترد کر کے نثر کو بے حد سادہ، منطقی اور ٹھوس بنا دیا تھا جو نفاست پسند

---

[1] اردو نثر میں ادبِ لطیف۔ ڈاکٹر عبدالودود۔ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ۔ دوم ۱۹۸۰ء ص ۸۲-۹۱

طبائع کو پسند نہ تھا۔ محمد حسین آزاد۔ میر ناصر علی اور عبدالحلیم شرر کی شاعرانہ نثر اسی سادگی اور منطقیت کے ردعمل کا نتیجہ تھی۔ یہی وجہ ہے میر ناصر اور شرر کو انشائے لطیف کے پیش رو مصنفین میں شمار کیا جاتا ہے۔ سر سید احمد خاں اور ان کے رفقا نے سادہ نویسی کے علاوہ اپنے اصلاحی مقاصد کے تحت حسن و عشق کے بیان سے قصداً گریز کر کے ادب میں جو اخلاقی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ انگریزی خواں نوجوان طبقہ اس سے ایک طرح کی گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کا سارا ادب اخلاقی اور مقصدی ہونے کے سبب یکسانیت اور جمود کا شکار ہو چکا تھا اس جمود اور یکسانیت کو توڑنے کے لئے جس انقلاب کی ضرورت تھی وہ انشائے لطیف کی صورت میں سامنے آیا۔ چنانچہ انشائے لطیف کے مصنفین نے شاعرانہ اسلوب اور حسن و عشق کے تخیلی بیان کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ انشائے لطیف کے مصنفین اگرچہ حسنِ فطرت کے بھی دلدادہ ہیں اور منظر نگاری کی طرف خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ مگر صنفِ نازک کے بیان میں انہوں نے جس وارفتگی کا مظاہرہ کیا وہ ادب میں اخلاقیات ہی کا ردِ عمل معلوم ہوتا ہے۔

سر سید احمد خاں نے اگر ادب کو اجتماعی مفاد کا پابند کیا تو انشائے لطیف کے مصنفین نے ادب کو انفرادی خیالات و محسوسات کا ترجمان بنایا۔ سر سید نے عقلیت اور حقیقت نگاری پر زور دیا تو انشائے لطیف کے مصنفین نے جذبات اور حسن و عشق کی تصوراتی دنیا کی تخلیق کی طرف توجہ کی چنانچہ اردو ادب میں انشائے لطیف کی تحریک کو صرف انگریزی ادب کی جمالیاتی تحریک سے تاثر کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تحریک ہمارے اپنے سماجی حالات اور ادب میں اخلاقیت کے رجحان کا ردِ عمل بھی ہے۔ یہی وجہ ہے انشائے لطیف کی تحریروں میں شاعرانہ اسلوبِ نگارش کے علاوہ جنس اور صنفِ نازک کا خاصا عمل دخل ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ انشائے لطیف کا انشائیہ سے کیا تعلق ہے؟ انشائیہ کے ضمن میں یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ انشائیہ ایک مخصوص صنفِ ادب ہے جس کے نمایاں اوصاف تخلیقی تازگی، اختصار، ذہن کی آزادہ روی، عدم تکمیل اور نکتہ آفرینی ہیں۔ اس کی ہیئت عموماً مضمون کی سی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انشائے لطیف ایک ذہنی رجحان ہے جو جذباتیت، تخیل کی پرستش حسن و عشق کے والہانہ اظہار اور انفرادیت و انانیت سے عبارت ہے اس رجحان کی کارفرمائی کسی ایک صنفِ ادب تک محدود نہیں بلکہ ایک مخصوص دور کی تمام اصنافِ ادب میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یلدرم، نیاز، مجنوں، ل، احمد اور خلیقی کے افسانے اور ناول، مہدی، نیاز اور مجنوں وغیرہ کی تنقیدات، سجاد، جوش، میاں بشیر احمد اور فلک پیما وغیرہ کے مضامین سبھی انشائے لطیف کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ اس لحاظ سے انشائے لطیف کی اصطلاح بے حد وسعت کی حامل ہے اور اس میں ہر قسم کی نثری تحریروں کے سما جانے کی گنجائش ہے دراصل انشائے لطیف کا اطلاق ایسی تحریروں پر ہوتا ہے جن میں اسلوب کا حسن بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ خواہ یہ تحریریں کسی بھی موضوع اور صنف سے تعلق رکھتی ہوں۔ جبکہ انشائیہ ایک الگ اور منفرد صنفِ ادب ہے جس کا ہئیتی رشتہ کسی حد تک مضمون سے استوار ہے۔ اس لئے زیرِ نظر مقالہ میں انشائے لطیف کے صرف انہی نمونوں سے بحث کی جائے گی جنہیں شاعرانہ یا عاشقانہ مضامین کے نام سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔

○

میر ناصر علی دہلوی اور عبدالحلیم شرر کو انشائے لطیف کے پیش رو مصنفین میں شمار کیا جاتا ہے۔ میر ناصر اور شرر میں سے اولیت کسے دی جائے؟ یہ مسئلہ بھی توجہ طلب ہے۔ میر ناصر عمر میں شرر سے بڑے تھے اور شاعرانہ اسلوب نگارش

کی ترویج و ترقی کے لئے انہوں نے ۱۸۷۶ء میں "تیرھویں صدی" کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ جو غالباً چار پانچ سال تک باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ اس لحاظ سے شاعرانہ نثر میں انہیں شرر پر تقدم حاصل ہے لیکن ان کی اصل شہرت "صلائے عام" کی وجہ سے ہے جو ۱۹۰۸ء میں جاری ہوا۔ اس کے برعکس شرر کی شہرت کا آغاز ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۲ء کے دوران ان مضامین سے ہوا جو انہوں نے رسالہ "محشر" میں "صبح کا سماں" کے عنوان سے مسلسل لکھے۔ ۱۸۸۷ء میں جب "دلگداز" جاری ہوا، شرر کی شہرت بام عروج پر تھی۔ یہ امر بھی مسلّم ہے کہ شاعرانہ نثر کا فروغ شرر کے ان مضامین سے ہوا جو ۱۸۸۷ء سے ۱۸۸۹ء کے دوران "دلگداز" میں شاعرانہ مضامین کے نام سے شائع ہوئے۔ اس لحاظ سے شرر کا ذکر پہلے ہونا چاہیے مگر چونکہ "تیرھویں صدی" کے مضامین بھی شاعرانہ نثر کا نمونہ ہیں اور یہ بات بعید از امکان نہیں کہ شرر "تیرھویں صدی" کے اسلوب سے متاثر ہوئے ہوں لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میر ناصر کا ذکر پہلے کیا جائے کیونکہ تیرھویں صدی کی وجہ سے انہیں زمانی تقدم حاصل ہے۔

محمد حسین آزاد کی طرح میر ناصر بھی اپنے منفرد اور دلکش اسلوبِ نگارش کی وجہ سے اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ بھی سر سید احمد خاں کی سادہ نویسی کی تحریک کو اردو نثر کے حق میں نقصان دہ سمجھتے تھے۔ اور اس نظریہ کے حامی تھے کہ اردو نثر ہر قسم کی نازک خیالی کی متحمل ہو سکتی ہے لیکن وہ اردو کی قدیم طرز کی مقفیٰ اور مسجّع انشا پردازی کی محدودیت سے بھی آگاہ تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی آزاد کی طرح قدیم و جدید کے امتزاج ہی کو مناسب جانا۔ تشبیہ و استعارہ کا معتدل استعمال اور مرصّع کاری ان کے اسلوبِ نگارش کا خصوصی امتیاز ہے۔ فقرے مختصر ہوں یا طویل، اپنی دلکشی اور روانی کے باعث قاری پر بوجھ نہیں بنتے۔ تاہم اشعار

Scanned by CamScanner

کا بے دریغ استعمال بعض اوقات ان کی نثر کی روانی میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ چونکہ "تیرھویں صدی" اور "صلائے عام" سر سید احمد خاں کی سادہ نویسی اور ان کے نیچری خیالات کا جواب دینے کے لئے جاری کئے گئے تھے اس لئے ان کے بیشتر مضامین سر سید احمد خاں کے مضامین کے جواب میں ہیں میر ناصر خامے حسن پرست بھی تھے ان کی حسن پرستی صرف اندازِ تحریر کی خوبصورتی تک محدود نہ تھی بلکہ صنفِ نازک کا حسن بھی ان کی تحریروں کا خاص موضوع ہے اور اس موضوع پر ایک خاص وارفتگی کے عالم میں اظہارِ خیال کرتے ہیں، یہ وارفتگی کہیں کہیں عریانیت کی حدوں کو چھوتی ہوئی بھی محسوس ہوتی ہے۔ وہ شاعرانہ اندازِ بیان کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔ اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے جس میں سر سید احمد خاں اور ان کے رفقا کے خشک اور منطقی اسلوب پر تنقید کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"ان سے بدتر ان کے اور لکھنے والوں کا حال ہے جو بدگمانی اور مصیبت وغیرہ پر لکھ چکے ہیں۔ باوجود ایسے وسیع مضامین کے کہیں تو کوئی نئی بات کہتے اور نہیں تو ان کی سرخیاں ہی ذرا پھڑکتی سی رکھتے۔ بدگمانی سے "زشتیِ گماں" لکھنا اچھا تھا۔ اور نری مصیبت وغیرہ سے "دادِ دردِ درماں" دل کو زیادہ چبھتا۔ مگر یہ نئی روشنی والے اپنے پرانے چراغوں کو ذلیل سمجھ کر ولائتی لیمپ و فانوس کی طرف دوڑتے ہیں جن کے جلانے کے پیچوں سے ابھی تک واقف نہیں۔ تماشا ہے کہ یہ تو جلاتے نہیں بنتی اور گھر کے چراغ بجھائے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اندھیرے میں ٹٹولتے رہ جاتے ہیں"۔ [1]

ایک اور مضمون میں "صلائے عام" کی خوبیاں ان الفاظ میں بیان کی ہیں

---

[1] مقالاتِ ناصری مرتبہ سید انصار ناصری۔ انجمن ترقیٔ اردو پاکستان۔ کراچی ص ۱۵۹- ۱۶۰

"ملائے عام" کی خوبیوں میں اس بات کا زیادہ خیال رہتا ہے کہ نازک خیالی اور پاکیزہ بیانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہو۔ کمالِ فصاحت اور کمالِ انشا پردازی کی داد دی جائے۔" لہ

اور اس میں شک نہیں کہ انہوں نے نازک خیالی اور شستہ بیانی کا حق ادا کر دیا۔

مضامین علمی ہوں یا فکری وہ نازک بیانی اور کمالِ انشا پردازی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہتے۔ ان کے طرزِ بیان پر قدامت بھی فدا ہے اور جدت بھی قربان۔ وہ انگریزی ادب سے متاثر ضرور تھے۔ مگر اس سے مرعوب نہیں تھے۔ خصوصاً وہ یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ رنگین عبارت جدید خیالات کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ انہوں نے ہر قسم کے مضامین میں اس رنگ کو جس خوبی سے برتا وہ ان کے دعویٰ کا عملی ثبوت ہے۔

میر ناصر کے بیشتر مضامین میں انشائیہ کا انداز بھی جھلکتا ہے۔ خصوصاً "مسکرانا" "ہم اور ہماری ہستی" "تالِ زندگی" "یادش بخیر" وغیرہ ایسے مضامین ہیں۔ جن میں ذہن کی آزادہ روی اور موضوع کو نئے زاویئے سے دیکھنے کا رجحان موجود ہے۔ یہ مضامین اختصار اور نا تمامیت کی خصوصیت بھی رکھتے ہیں۔ اور تخلیقی تازگی تو میر ناصر کی تمام نگارشات کا خصوصی امتیاز ہے۔ چنانچہ ان مضامین کو انشائیہ قرار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ "مضمونِ پریشان" کے عنوان سے جو مضامین لکھے گئے وہ بھی آزادہ روی کے مظہر ہیں اور انگریزی انشائیہ کی تقلید ہی میں لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان مضامین میں بھی جزوی طور پر انشائیہ کا

لہ۔ مقاماتِ ناصری مرتبہ سید انصار ناصری ص ۲۵۶

مداز موجود ہے۔ "شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے گذرگاہِ خیال" "از گہوارہ تاگور"۔
مانے کی صبح وشام۔ حسنِ عالمِ اسباب۔ موت اور تصویر کے متعلق چند خیالات
رہ مضامین میں بھی جزوی طور پر غیر رسمی اندازِ بیان، اختصار۔ عدم تکمیل اور
عاپن پایا جاتا ہے اور موضوع کے چھپے ہوئے گوشوں کو بے نقاب کرنے کی
شش کی گئی ہے۔ چنانچہ یہ مضامین انشائیہ سے بے حد قریب ہیں "مسکرانا"
کا ایک اقتباس ہے۔

"مسکرانا ہنسی سے کہیں اچھا ہے کہ ہنسی میں ذرا بھدا پن ہے اور چپ رہنے سے بھی بہتر ہے کہ خموشی سے دل کا حال نہیں معلوم ہوتا۔ مسکرانے سے دل کا حال بغیر بھدے پن کے معلوم ہو جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں۔ یار کی ساری جفائیں اک ذرا سے مسکرانے سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں۔ جس قدر عمر کم ہو اور مکروہاتِ زمانہ سے علیحدگی ہو مسکرانا اسی قدر زیادہ دلکش معلوم ہوتا ہے۔ مسکرانا پاکیزہ طبعی کا ثبوت ہے۔ بگڑی طبیعتیں مسکرانا نہیں جانتیں۔ مصوری میں چہرہ بنانا آسان ہے مگر مسکراہٹ دکھانا ذرا مشکل ہے۔ سارا بدن زخمی ہونا اور چیز ہے اور خدنگِ نظر کا زخم اور ہے۔ پیر میں ضرب آنی اور بات ہے اور دل کی چوٹ اور چیز ہے۔ زبان اور کلام میں وہ بات کہاں جو کسی کے ذرا مسکرا دینے میں ہے۔ مسکرانے میں چہرے کی ساری خوبیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ مسکرانا چہرے کا زیور ہے۔ چہرے کی شکنیں جو رنج میں پیدا ہو جاتی ہیں مسکرانے سے مٹ جاتی ہیں۔ شقاوت وسختی جاتی رہتی ہے۔ اسی لئے پریوں فرشتوں اور اولیا اللہ کی تصویریں اکثر مسکراتی ہوئی دیکھنے میں آئیں کہ مسکرانا اطمینانِ باطن کی علامت ہے۔ جلاد خونی اور قصاب کے چہرے کبھی مسکراتے نہیں دیکھے۔ مسکرانے سے بدشکل بھی

اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور خوبصورت تو پری زاد بن جاتا ہے۔"[۵۱]

موت کے بارے میں اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں۔

"میں نہیں کہہ سکتا کہ انسان کے لئے موت اپنی ذات سے بہت ہیبت ناک ہونی چاہئے۔ وہ اسباب جن سے موت آئے البتہ ہولناک سمجھے جا سکتے ہیں۔ نہ کہ خود موت ہولناک سمجھی جائے۔ کوٹھے پر سے گرنا البتہ ہولناک ہے لیکن گرتے ہی دم نکل جانا تکلیف سے بچ جانا ہے۔ دنیا کے تمام درد تکلیفوں کا علاج موت ہے۔ جس سے دکھ درد مٹیں وہ خود تکلیفوں اور خوفوں کا باعث ہو۔ میری سمجھ سے باہر ہے۔ انسان کی پیدائش اگر پیدا ہونے والے کے لئے خوفناک ہو تو مرنا بھی مرنے والے کے لئے خوفناک ہونا چاہئے۔ ایک میں بے خبری اور دوسرے میں تکلیف معقول دلیل نہیں پیدا ہونے میں جس طرح صرف زچہ کو تکلیف ہوتی ہے اور بچے کو خبر نہیں ہوتی۔ اسی طرح موت میں دیکھنے والوں کو تکلیف ہو تو ہو مرنے والا ہر تکلیف سے چھوٹ جاتا ہے۔ موت دراصل ہر طرح کے محسوسات سے غفلت کا نام ہے۔

موت کو ہیبت ناک قرار دینا نازک خیالی کا خون کرنا ہے۔ اول تو خدا تعالیٰ نے اسلام میں موت کے لئے ایک فرشتہ مقرر فرمایا ہے اور خدا کی مخلوق میں فرشتے سے زیادہ پاکیزہ صورت اور پاکیزہ طبیعت دنیا میں کوئی چیز ستی نہیں۔ تیمارداری میں سب سے بہتر تیمارداری عزیزوں کی سمجھی جاتی ہے کہ اپنے ہیں اور ولایت میں عورتیں تیمارداری ... کے لئے

---

۵۱ مقاماتِ ناصری۔ ص ۳۸۱

زیادہ مناسب سمجھی جاتی ہیں کہ ان کا دل نرم ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا ہم
پر بڑا فضل و کرم سمجھئے کہ اخیر میں ہمیں فرشتے کی صورت دکھا دے گا۔" [۱]

مندرجہ بالا اقتباسات میں موضوع کو جس طرح نئے زاویئے سے دیکھنے کی
کوشش کی گئی ہے وہ انشائیہ کا بنیادی وصف ہے۔ ان تمام مضامین میں
اختصار اور تخلیقی تازگی بھی موجود ہے اور شخصی نقطۂ نظر بھی نمایاں ہے۔ لہٰذا
ان مضامین کو انشائیہ کی صف میں شامل سمجھنا چاہئے خصوصاً "مسکرانا" تو
جدید انشائیہ کے معیار پر بھی پورا اترتا ہے۔

اب تک جن مصنفین کے مضامین کا مطالعہ کیا گیا ہے ان کے مقابلے میں میر
ناصر کے مضامین میں انشائیہ کے اوصاف نسبتاً سب سے زیادہ نظر آتے ہیں۔ اس
بنا پر نیاز فتح پوری انہیں اردو کا پہلا انشائیہ نگار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"آپ نے ۱۸۷۶ء میں آگرہ اخبار آگرہ کے مالک مولوی محمد یوسف صاحب
کے اشتراک سے ایک جریدہ "تیرھویں صدی" کے نام سے جاری کیا جس
کا اصل مقصود تو غالباً سر سید احمد خاں کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے
مذہبی خیالات اور نیچری خیالات کا جواب دینا تھا۔ لیکن میر صاحب نے
اردو ادب میں ایک نئی صنفِ سخن کی بنیاد ڈالی جسے انگریزی میں ESSAY
کہتے ہیں اور اب اردو میں وہ انشائیہ نگاری کہلاتی ہے۔" [۲]

میری رائے میں نیاز فتح پوری کی یہ رائے قابلِ تسلیم نہیں کیونکہ میر ناصر کے جن
مضامین میں انشائیہ کے اوصاف نمایاں ہیں وہ سب ۱۹۰۸ء کے بعد لکھے گئے اور

---

[۱] مقاماتِ ناصری ص ۴۹۰ - ۴۹۱

[۲] مقاماتِ ناصری - میر ناصر ص ۲۷

"صلائے عام" میں شائع ہوئے۔ جب کہ شرر کے ایسے مضامین جن میں انشائیہ کے اوصاف موجود ہیں۔ ۱۹۰۸ء سے بہت پہلے ۱۸۸۷ء اور ۱۸۸۹ء کے دوران "دلگداز" میں شائع ہوئے۔ اس لحاظ سے شرر کو میر ناصر پر فوقیت حاصل ہے میر ناصر کا ذکر شرر سے پہلے محض اس لئے کیا جاتا ہے کہ انہیں "تیرھویں صدی" کی وجہ سے زمانی تقدم حاصل ہے اور وہ انشائے لطیف کے پیش رو مصنف ہیں ورنہ انشائیہ کے حوالے سے انہیں شرر پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔

حقیقت یہی ہے کہ ابھی تک شرر کے مضامین کا سنجیدگی سے مطالعہ کر کے مضامین نگاروں میں ان کے مقام و مرتبہ کا تعین ہی نہیں کیا گیا اور دانستہ یا نادانستہ انہیں ناول نگاری تک محدود کر دیا گیا ہے حالانکہ انہوں نے مختلف النوع مضامین کا اتنا وافر اور معیاری ذخیرہ چھوڑا ہے جو کسی لحاظ سے بھی پست و کمتر نہیں۔ میری رائے میں مضمون نگاری کی ترویج و ترقی میں سر سید احمد خاں کے بعد شرر کا نام ہی اہمیت رکھتا ہے۔ دورِ سر سید کے بعد بیشتر ادیبوں نے مضمون نگاری میں سر سید کی بجائے شرر ہی کو معیار سمجھا اور انہی کے انداز کو اڑانے کی کوشش کی۔ ۱۸۸۷ء میں جب "دلگداز" کا اجرا ہوا تو وہ صرف شاعرانہ مضامین کے لئے وقف تھا اگرچہ بعد ازاں اس میں ناول اور تاریخ کے صفحات بھی شامل کر لئے گئے۔ لیکن اس کے باوجود ۱۸۹۱ء تک اس کا خصوصی امتیاز شاعرانہ و عاشقانہ مضامین ہی سے تھا۔ یہی وہ مضامین ہیں جن میں انشائیہ کے اوصاف ملتے ہیں۔ یہ مضامین "مضامینِ شرر" کی پہلی جلد (حصہ اول و دوم) میں شامل ہیں یوں تو اس جلد کے تمام مضامین میں انشائیہ کی بعض خصوصیات موجود ہیں مثلاً ان تمام مضامین میں آزادہ روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بات سے بات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو انشائیہ کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

بعض مضامین میں موضوع کو نئے زاویئے سے پیش کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اس ضمن میں "کل"۔ "انتظار"۔ "لالۂ خودرو"۔ "او خیالِ یار جاتا ہے کہاں" اور "آسمان" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان مضامین میں آزادہ روی سے کام لینے کے علاوہ موضوع کے چھپے ہوئے گوشوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ ان میں شخصی زاویۂ نگاہ بھی نمایاں ہے اور اختصار کی خصوصیت بھی رکھتے ہیں نیز یہ انشائیے تخلیقی تازگی کا نمونہ بھی ہیں۔ ان انشائیوں کا اسلوب نہ مقفیٰ ہے اور نہ سرسید کے اسلوب کی طرح روکھا پھیکا ہے بلکہ قدیم و جدید کی درمیانی کڑی کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ شررؔ کے بیشتر انشائیوں کی آخری سطور ان کی مقصدیت کا واضح اعلان کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں ہم انشائیہ ہی کہیں گے۔ کیونکہ انشائیہ کے لئے جو خصوصیات لازمی قرار دی گئی ہیں یعنی تخلیقی تازگی، اختصار، شخصی زاویۂ نگاہ اور موضوع کو نئے زاویئے سے دیکھنے اور بیان کرنے کا وصف۔ یہ سب شررؔ کے انشائیوں میں موجود ہیں۔ جہاں تک شررؔ کے انشائیوں میں مقصدیت اور قومی معاملات و مسائل کے بیان کا تعلق ہے وہ اس دور کا مجموعی رجحان ہے جو تمام دردمند اہلِ قلم کے ہاں نمایاں ہے۔ اس دور میں مسلمان جس کسمپرسی کا شکار تھے اس کا بلاواسطہ اور بالواسطہ اظہار اس دور کے ادب میں جا بجا نظر آتا ہے اور ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا کہ ادب زندگی کے مسائل و معاملات سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ اہم بات یہ ہے کہ شررؔ نے بات سے بات پیدا کرنے کی خصوصیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معمولی موضوعات کے حوالے سے اہم قومی معاملات کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے یوں ان کے انشائیے براہِ راست وعظ و تبلیغ کے الزام سے بچ گئے ہیں۔ اس حوالے سے انہیں سرسید احمد خان پر فوقیت دی جا سکتی ہے۔ ان کے انشائیوں سے دو ایک اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"گل اگرچہ بعینہٖ نسیم سحر کا وہ جھونکا ہے جس کے پکڑنے کے لئے ہم ہزار ہاتھ بڑھائیں مگر کبھی ہماری مٹھی میں نہ آئے گا۔ لیکن اس کی امیدوں کو ٹھہرا ٹھہرا کر بڑھانے والی رفتار سچ پوچھئے تو بڑے کام آتی ہے۔ انسانی فطری حالت کے سمجھنے والے خوب اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہر کام میں جب تک کامیابی نظر کے سامنے نہیں رہتی کوشش نہیں ہو سکتی۔ لذتِ وصل پیشِ نظر نہ ہو تو فراق کا صدمہ کس سے اٹھایا جائے؟ لیاقت کا در آبدار نگاہ کو اپنی دلبستگیوں میں نہ لگائے رہے تو پڑھنے لکھنے کی محنت کون کر سکے! کل کا روز کس قدر ہمارے کام آتا ہے کہ جس کام کے لئے ہم جانفشانی اور مشقت کرتے ہیں اس کے دلفریب نتائج ہر وقت نگاہ کے سامنے رکھتا ہے۔ ہائے یہی سبب ہے کہ ہمدردانِ قوم کو اگرچہ کوئی فائدے کی صورت نظر نہیں آتی۔ مگر دامنِ فردا پر کامیابی کا دلربا نقش دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور جان توڑ توڑ کر محنت کرتے ہیں" [1]

"دنیا اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب ازلیت کو انتظار کی بے خودی سے چونک پڑنے کا اتفاق ہوا اور اس وقت تمام ہو جاتی ہے جب آنکھوں پر غنودگی طاری ہوتی ہے اور انتظارِ ابد کی بے خودی ہوش و حواس پر غالب آ جاتی ہے۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ہماری فطری حالت ایک انتظار کا سکوت ہے تو نازیبا نہ ہوگا۔ قطع نظر اس سے کہ دنیاوی زندگی کا آغاز اور انجام انتظار ہی ہے۔ انتظار کو ایک فطری اور طبعی حالت ثابت کرنے کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کو جب تمام کاموں سے فراغت ملتی ہے اس

---

[1] مضامینِ شرر۔ عبدالحلیم شرر۔ ص ۲۷۔ ۲۸۔ جلد اول

وقت چپکے بیٹھ جاتا ہے اور خیال آئندہ امیدیں یاد دلا دلا کر انتظار کا مشغلہ پیدا کر دیتا ہے۔"[1]

ایک اور انشائیہ کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو۔ انشائیہ کا عنوان ہے۔

اوخیالِ یار جاتا ہے کہاں۔ دو گھڑی دل تجھ سے بہلاتے ہیں ہم۔

"لوگ اس وقت تک خیال کو ایک ایسی چیز سمجھے ہوئے ہیں جو واقعات کے خلاف ہے اور اسی وجہ سے اکثروں کو یہ کہنے کی بھی جرأت ہو گئی ہے کہ خیال   ایک وہمی پیکر کا نام ہے۔ جس کو واقعیت سے کوئی علاقہ نہیں لیکن اصل یہ ہے کہ واقعیت بھی خیال کے تابع ہے۔ تجربہ خیال کی گود میں پلتا ہے اور کل واقعات خیال کے قائم کئے ہوئے مسودے اور خاکے کی پابندیوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہی خیال ایک طرف آسمان کے تارے توڑنے کو جاتا ہے اور دوسری طرف سمندر کی تہہ میں پہنچتا ہے کہ اس کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور قیمتی سے قیمتی خزانے نکال لائے۔"[2]

مندرجہ بالا اقتباسات میں موضوع کو نئے زاویئے سے پیش کرنے کا جو انداز ہے۔ وہ انشائیہ کی بنیادی خوبی ہے۔ ان اقتباسات میں شخصی زاویۂ نگاہ بھی نمایاں ہے اور تخلیقی تازگی کا احساس بھی ہوتا ہے اور چونکہ یہ خوبیاں شررؔ سے قبل کے مصنفین کے ہاں اس طرح یکجا نہیں اس لئے شررؔ کو اردو کا پہلا کامیاب انشائیہ نگار کہنا غلط نہ ہوگا۔

○

انشائے لطیف کی ترویج و ترقی میں شررؔ کے رسالہ "دلگداز" کے بعد "مخزن"

---

[1] مضامینِ شرر۔ عبدالحلیم شررؔ۔ (جلد اول) صہ ۱۰۵

[2] ایضاً صہ ۳۱۸

کا نام بے حد نمایاں ہے۔ تاہم مخزن کے کچھ مضمون نگار ایسے بھی ہیں جنہیں انشائے لطیف کے مصنفین میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً مخزن کے مدیر سر عبدالقادر، آغا شاعر قزلباش، محمد اکرم، عبدالرشید چشتی، مولوی عزیز مرزا اور سر ذوالفقار علی خاں وغیرہ ایسے لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اسلوب کی ادبیت کو تو پیشِ نظر رکھا لیکن اسلوب ہی کو سب کچھ نہیں سمجھا۔ چنانچہ وہ تخیلی و تصوراتی فضا جو انشائے لطیف کے مصنفین کا خصوصی امتیاز ہے۔ ان ادبا کی نگارشات میں نظر نہیں آتی۔ ان کی تحریروں میں مذہب اور جنس کے بارے میں وہ آزاد خیالی بھی نہیں جس کے سبب انشائے لطیف کی تحریروں کو بعض حلقوں میں ناپسند بھی کیا گیا لیکن ان ادیبوں نے سرسید احمد خاں کی قطعیت اور سادگی کو بھی نہیں اپنایا بلکہ اعتدال و توازن کو قائم رکھا۔ یہ مضمون نگار اپنے مخصوص اسلوبِ نگارش کے باعث اردو مضمون نگاری کی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

ان مضمون نگاروں میں سے بعض کے ہاں انشائیہ کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً آغا شاعر قزلباش کا مضمون "کھلتا ہوا پتا" اسلوب کی تازگی، موضوع کی ندرت اور شخصی زاویۂ نگاہ کے سبب انشائیہ میں شامل ہونے کے لائق ہے۔ اس مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"میرے گھر میں ایسے درخت کا گملہ ہے جس میں پھول پھل تو نہیں آتا۔ مگر ہاں اس کے پان سے پتے لال لال اور بڑے بڑے ہو کر بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک چھوٹا سا پودا ہے اس لئے اس کی بساط کے موافق ہر شاخ میں دو دو تین تین ہی پتے آیا کرتے ہیں۔ مگر وہ بھی باری باری سے۔ یعنی جب ایک پتہ پورے طور پر اپنی بہار دکھاتا ہے تو جل کر گر پڑتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے کھلنے کا عالم بھی نرالا

Scanned by CamScanner

ہوتا ہے۔ لال لال ڈنٹھل میں سے پہلے ایک مہین سی گجی نوک پیدا ہوتی ہے جو بڑھتے بڑھتے نکھرتے نکھرتے کوئی پانچ چھ دن میں ایک سبز پتی سی بن جاتی ہے اور یہی درحقیقت وہ لپٹا ہوا پتا ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ نسیم سحر کے پوے پوے ہاتھوں کی ہلکی ہلکی جنبش اور بادل اور شبنم کے گول گول موتیوں کی نچھاور اس پر ہوتی جاتی ہے۔ سورج کی دھیمی دھیمی شعاعیں اِدھر ادھر پڑتی جاتی ہیں۔ اتنی ہی اتنی یہ پھول سی پتی لمبی ہو ہو کر کھلتی بھی جاتی ہے۔ اور ایک ایک اٹھوارے کے بعد وہی راز سربستہ ایک پنجۂ نگاریں میں ہو جاتا ہے۔ جب یہ کھلنا شروع ہوتا ہے تو ان کی نیم وا حالت ان نازک انگلیوں کی جھلک مارتی ہے جو حنا کی بدولت خون میں ڈوبے ہوئے نشتر کہلاتی ہیں۔ اس کی سرخ سرخ رگیں جب آپس میں پھیل پھیل کر مل جاتی ہیں تو یہ عین اس نازنین مظلومہ کا کمزور ہاتھ معلوم ہوتا ہے جس نے قاتل کی ننگی تلوار روکنے کے لئے گھبراہٹ میں اپنی گوری گوری ہتھیلی آگے کر دی ہو اور وہ لہولہان ہو کر رہ گئی ہو۔

میرے دوستو! جب تک یہ پتا کھلتا نہیں ہے اور اک سربند کلی کی طرح رہتا ہے اس وقت تک میں کیا بتاؤں کہ دن میں کے کے دفعہ میری نگاہیں اس تک جاتی ہیں اور مایوس پلٹ آتی ہیں۔ یہ کھلنا شروع ہوتا ہے اور میری بے قراری پہلے سے بھی دوچند و سہ چند ترقی کر جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بالکل کھل جاتا ہے اور وہ میری لب تشنہ نظریں اس کی رنگینیوں سے لبریز ہو کر بالکل سیر ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ اپنی عمر کی معیاد تک برابر کھلا رہتا ہے۔ مگر خدا جانے کیا بات ہے کہ پھر مجھے اس کی طرف سے کچھ ایسی سادات ہو جاتی ہے کہ کبھی بھولے سے بھی نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھتا۔ ہاں جب

کبھی دھیان بٹتا ہے تو کدھر؟ اس دوسری پتی کی طرف۔ اس امید میں
کہ دیکھئے وہ کب کھلتی ہے۔ آہا! اس میں ایک عجیب بھید ہے۔
اس میں ایک طرفہ جدت ہے بلکہ اس میں اچھی خاصی نصیحت پوشیدہ ہے۔
جسے کھلے ہوئے پتّے کے خطوں نے ذرا سے غور کے بعد حرف بہ حرف
کہہ دیا۔ کمال اور نقص میں کچھ یوں ہی سا فرق ہے۔ کمال کے بعد ہی زوال
شروع ہو جاتا ہے۔ جس کی دھیمی نمائش بہت کم دکھائی دیتی ہے صرف
مٹھی کھلنے کی دیر ہے۔ خدا نہ کرے جو کسی کی مٹھی کھلے۔ کلی کلی کی رسیا
نگاہیں خوشبو بن کر اڑ جاتی ہیں۔ اور پھر ادھر بھولے سے بھی نہیں بھٹکتیں
راز سربستہ جب تک سربستہ ہے بالکل محفوظ اور مقید ہے جہاں اس کی
ذرا سی پھوٹی اور بس ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔

اپنا راز جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اپنی مٹھی کھول دینی سراسر نادانی
ہے۔ دوسرے سے اپنا بھید کہہ دینا اس کا غلام بن جانا ہے۔ بھلا یہ
کون سی دانائی ہے کہ اپنی تمام قوتیں، اپنا جوش، اپنی عزت، اپنی آبرو
دفعتہً دوسرے کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں۔ دنیا والو! دنیا میں بھرم
عجیب چیز ہے اور بے اعتباری سخت ذلّت۔ اپنا بھرم رکھنا گویا دوسروں
سے اپنی عزت کرانا ہے۔ اس لئے اپنے خزانے کی کنجی دوسرے کی جیب
میں ڈال دینی دیدہ دانستہ اس کا محتاج بننا ہے۔ مٹھی کھلنے کے بعد کبھی
بند نہیں ہو سکتی۔ اور گئی ہوئی خوشبو کبھی نہیں پلٹتی۔ اپنا راز جب تک
اپنے دل میں ہے اسے ذرا آنچ نہیں اور جہاں دوسرے کو ہمراز بنایا
ہمیشہ نگاہیں کھوئی ہوئی دیکھیں۔ اے اس نئی روشنی کی جھلک سے
ٹٹول ٹٹول کر چلنے والو! کھلتا ہوا پتا گویا دو دن کی بہار تھا اور پھر دفعتہً

نظروں سے گر گیا اور نظر سے گرتے ہی جل کر تھاوے میں آ پڑا۔ جہاں سے ہوا نے اسے زمین پر پھینک دیا اور دوسرے دن جھاڑو کی سینکیں لے دروازے کے باہر بھی کر آئیں۔ میں نے پھر جھوٹوں بھی نہ دیکھا کہ اس کی کیا نوبت ہوئی۔ اور کس درجہ کو پہنچا۔" ؎

اس مضمون میں جو شگفتگی اور بے تکلفی ہے اور جس طرح بات سے بات پیدا کی گئی ہے اس کے پیشِ نظر اسے انشائیہ میں شامل سمجھنا چاہئے۔ اسی طرح سر ذوالفقار علی خاں کا مضمون "آرزو" بھی موضوع کو نئے زاویئے سے دیکھنے کی عمدہ مثال ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"آدم کا خلد سے نکلنا ایک قصہ ہے جو لوگوں کی زبان پر ہے مگر ایک حقیقت ہے جس سے لوگ ناآشنا ہیں۔ ایک آرزو کے پتلے کو جنت سی ازلی ابدی غیر منقلب و غیر متبدل جلوہ گاہ میں پیدا کرنا اور پھر وہاں آباد ہونے کا حکم دینا محض ایک بہانہ تھا اور ایک حکمت ـــــ خدا جانتا تھا کہ آدم کی آنکھ کھلتے ہی اس کا جی ان مناظر کو للچائے گا۔ یہ جو کچھ دیکھے گا اس کے حصول کا خواہشمند ہوگا۔ جسے حاصل کرے گا اس پر تصرف کی سعی کرے گا مگر بغیر آدم کو جنت میں پیدا کرنے اور اسے نامور کرنے کا کوئی بہتر طریقہ مصلحت میں نہ تھا۔ پیدا تو آدم کو دنیا میں کرتے مگر دنیا کے مناظر کب ہم پلہ ہو سکتے تھے؟ مقصود یہ تھا کہ آدم کے سینے میں آرزوئیں تو مناظرِ جنت کی بھری جائیں اور پھر دنیا میں اتارا جائے تاکہ اگر قیامت تک مناظرِ ہستی ختم بھی ہو جائیں تو اس کی آرزوئیں ختم نہ ہوں۔ ان میں

؎ اردو کا بہترین انشائی ادب۔ ڈاکٹر وحید قریشی صہ ۱۳۳ تا ۱۳۵

Scanned by CamScanner